راوی فاؤنڈیشن انٹرنیشنل کے زیرِ اہتمام مسلسل اشاعت کا ۴۴واں سال

Monthly
Arxang
Lahore

ماہنامہ
ارژنگ
لاہور

دسمبر 2012ء

مدیرِ اعلیٰ: عامر بن علی

مدیر: حسن عباسی

لاہور آرٹس کونسل کے زیرِ اہتمام سہ روزہ الحمرا قومی ادبی و ثقافتی کانفرنس

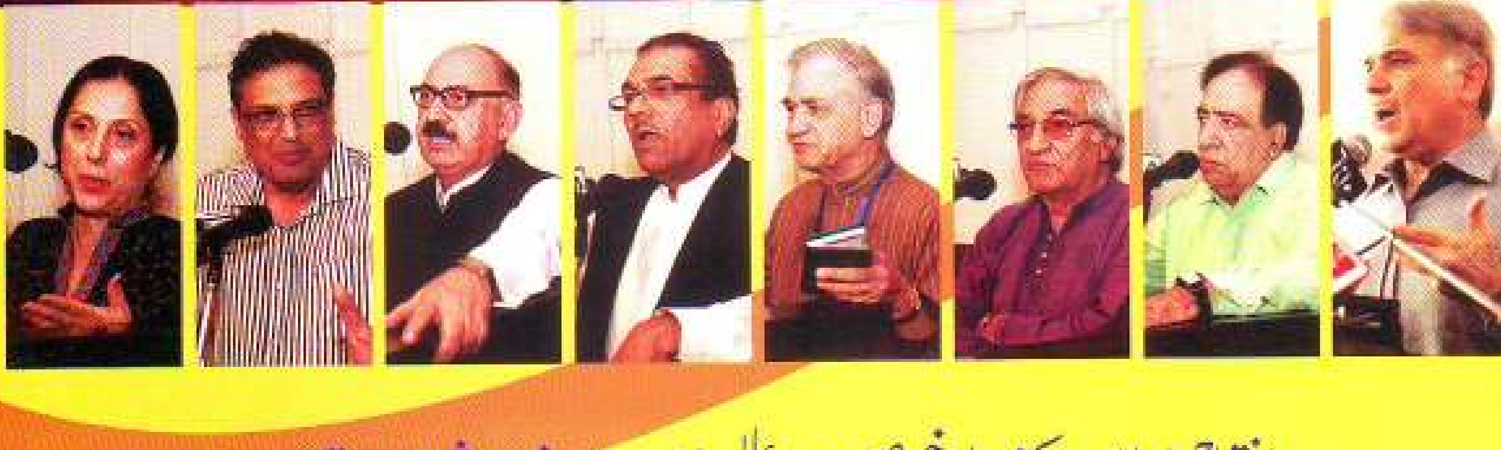

افتتاحی اجلاس کے مہمان خصوصی وزیرِ اعلیٰ پنجاب میاں شہباز شریف تھے

پروین شاکر ٹرسٹ کے زیر اہتمام عکس خوشبو ایوارڈ کی تقریب

حسن عباسی، شہزاد نیئر اور احمد عطاء اللہ کو اُن کے شعری مجموعوں پر ایوارڈ دیے گئے

شہزاد نیئر کے شعری مجموعے "چاک سے اُترے وجود" کو 2009ء کا عکس خوشبو ایوارڈ دیا گیا

حسن عباسی کے شعری مجموعے "اک شام تمہارے جیسی ہو" کو 2010ء کا عکس خوشبو ایوارڈ دیا گیا

احمد عطاء اللہ کے شعری مجموعے "ہمیشہ" کو 2011ء کا عکس خوشبو ایوارڈ دیا گیا

"اور مت پردہ پوشی کرو حق کی جھوٹ سے نہ چھپاؤ سچائی کو جب تم جانتے ہو" (القرآن)

MONTHLY ARXANG LAHORE

ماہنامہ ارژنگ لاہور

جلد نمبر 14 دسمبر 2012ء شمارہ نمبر 8

چیف ایڈیٹر: عامر بن علی

مدیر
حسن عباسی

مدیران اعزازی
ڈاکٹر صغرا صدف، ابرار ندیم

ڈپٹی ایڈیٹرز (اعزازی) زبیر بشیر، صفدر علی صفدر (کویت)
اسسٹنٹ ایڈیٹر: کامران ندیم

حمدیہ ماہیے — نذیر اے قمر ۲

گوشہ نعت — خورشید بیگ میلسوی ۳

سلام — مرتضیٰ ساجد، سرور ارمان، جعفر حسن مبارک، اسد رضوی، سعدیہ سیٹھی، ابرار ندیم، رائے عابد، شبہ طراز، عامر بن علی، حسن عباسی ۴ تا ۵

مضامین

شریف خواتین اور غزل — عطاءالحق قاسمی ۶

سرخ لہلہاتے گلاب — حافظ مظفر محسن ۸

ہائے اور ہا — افتخار مجاز ۹

"ہاتھ دل سے جدا نہیں ہوتا"......ایک تاثر — احمد جلیل ۱۱

متفرق شاعری ۱۳ تا ۱۴

افسانے

اکیلا مکان، اُداسی اور میں — دستگیر شہزاد ۱۵

کہانی کار — نیازت علی نیاز ۱۸

شعری گوشے

نبیل صابری، ضمیر طالب، نیلما ناہید درانی، قمر رضا شہزاد، شاہین عباس، عرفانہ امر، سعید الظفر صدیقی، نزہت عباسی، حسنین سحر، اشفاق ناصر، سید مقبول حسین، قیصر مسعود، ارشد نذیر ساحل، اقبال طارق، احمد عطاءاللہ، یاسمین، جاوید رضی، شازیہ نورین ۲۲ تا ۴۱

الحمرا ادبی کانفرنس — آغا تنویر ۴۲

ادبی خبریں/تقریبات — نگہت اکرم ۴۳

نامہ ہائے احباب ۴۶

زر سالانہ مع ڈاک خرچ مبلغ 1000 روپے
بذریعہ منی آرڈر ارسال فرمائیں

email: nastalique786@gmail.com

برائے خط و کتابت

نستعلیق پبلی کیشنز
الفیروز سنٹر، غزنی سٹریٹ اُردو بازار لاہور
0092+423+7351963 / 0300-4489310

E.Mail: arzangpk@yahoo.com

FAR EAST MARKETING CO.
SAMARIA MANSION 605 KOENJI-MINAMI 1-6-5,
SUGINAMI-KU, TOKYO, 166-0003, JAPAN
E-MAIL: femc1@hotmail.com

عامر حسین پبلشرز نے زاہد بشیر پریس ریٹی گن روڈ سے چھپوا کر اردو بازار لاہور سے شائع کیا۔

نذیر اے قمر / میڈرڈ (اسپین)

حمدیہ ماہیے

نذیر کی شاعری روایت اور جدت سے ہم آہنگ ہے۔ ان کے ماہیوں میں تنوع، ندرت، جبلی محرکات، حسن پرستی، منظر، پس منظر اور اپنے اردگرد کے واقعات وحادثات ہویدا نظر آتے ہیں۔ نذیر اے قمر کا اسلوب اور الفاظ کا انتخاب عالمانہ اور غیر متعصبانہ ہے۔ آدمی دو طرح کے ہوتے ہیں تخلیقی اور غیر تخلیقی۔ تاریخ شاہد ہے کہ تخلیقی آدمی صرف اپنی بات ہی نہیں کرتا بلکہ پورے سماج کی اجتماعی بات کرتا ہے اور وہ اپنے عہد کا نمائندہ ہوتا ہے۔ نذیر اے قمر نے اُردو ماہیوں میں ادبی معیار کو برقرار رکھتے ہوئے انھیں سادہ فصیح اور معانی کے حریری پیراہن عطا کیے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ سارا زمانہ نذیر اے قمر کے قلم کی زد میں ہے اور وہ جسے چاہتا ہے اپنے ماہیوں کا موضوع بناتا ہے۔ اُنھوں نے ادبی مسافت میں خود کو آبلہ پائی سے نوازا ہے۔ لہو لہو اپنے نقش راہ و معانی میں ثبت کیے ہیں۔ نذیر اے قمر ادبی کارواں کا سالار نہیں بلکہ آخری صف کا سپاہی بننا پسند کرتا ہے۔ (اسد اعوان/ساہیوال)

ان چاند ستاروں میں
سب جلوے خدا کے ہیں
باغوں میں بہاروں میں

جب حمد لکھی تیری
احساس مسرت سے
حالت ہے عجب میری

خلقت سے جدا ہے وہ
اُسے نیند نہیں آتی
سب دیکھ رہا ہے وہ

مت پوچھ خدا کیا ہے
ہر چیز پہ لکھا ہے
خالق کے سوا کیا ہے

صد شکر ترا مولا
اُوپر کئی ہاتھوں کے
مرا ہاتھ رہا مولا

کیا بات کہوں تجھ سے
کیا چیز مسافت ہے
رب دور نہیں مجھ سے

معلوم نہیں کیسے
مجھ کو ہے یقیں اس کا
رب پاس ہے شہ رگ کے

کوئی لفظ نہیں ایسا
جیسی ہے تری قدرت
یا آپ ہے تو جیسا

خالق کو مناتا ہوں
دربار الٰہی میں
جب سر کو جھکاتا ہوں

اندر تو ہے، باہر تو
ہر شے میں ترے جلوے
ہر شے میں ہے ظاہر تو

سب کچھ ہے زمانے میں
بخشش کے سمندر ہیں
خالق کے خزانے میں

تیرا کرم ہے تو نے مجھ کو دریا کر ڈالا
ورنہ میں تو قطرہ رہنے پر بھی راضی تھا
(منیر سیفی)

خورشید بیگ میلسوی/میلسی

کیسے بیاں ہو مجھ سے بھلا شانِ مصطفیٰ   قرآنِ پاک خود ہے ثنا خوانِ مصطفیٰ

خورشید بیگ میلسوی معروف غزل گو اور نقاد ہیں۔ ان کا نعتیہ کلام پڑھ کر دل میں حبِ مصطفیٰ کے چراغ جلتے چلے جاتے ہیں۔ وہ اپنے نعتیہ کلام کے تخلیق کا پانی اپنے اشکوں سے حاصل کرتے ہیں۔ اُن کی نعت گداز دلوں کو اور گداز بناتی ہے اور رہروانِ شوق کا شوق فزوں کرتی ہے۔ اگرچہ وہ طویل عرصہ سے میلسی میں مقیم ہیں لیکن اُن کا نعتیہ کلام پڑھ کر یوں لگتا ہے جیسے اُن کا دل مدینے میں آباد ہے۔ (ارژنگ)

دل میں جب اُتری محمد مصطفیٰ کی روشنی
عرش تک پہنچی مرے حرف و صدا کی روشنی

جانبِ سدرہ رواں ہے کون یہ ذی احتشام
ہے زمیں سے آسماں تک انتہا کی روشنی

یک زباں ہو کر کہا شب زادگانِ دہر نے
تیرگی کی موت ہے "غارِ حرا" کی روشنی

پھر اسیرِ ظلمتِ شب ہیں تیری اُمت کے لوگ
اب بچا سکتی ہے ان کو کربلا کی روشنی

دیکھ کر حسنِ "یدِ بیضا" فرشتوں نے کہا
ہے فزوں تر آپؐ کی نعلینِ پا کی روشنی

پتھروں کی بے زبانی کو زباں کر دے عطا
یا نبیؐ تیرے لبِ معجز نما کی روشنی

ہر جگہ ہر عہد میں ہر فکر میں تا بہ ابد
"مستند ہے سیرتِ خیر الوریٰ کی روشنی

رکھ لیا میرے خدا نے تیرہ بختی کا بھرم
مل گئی خورشید اُن کے نقشِ پا کی روشنی

کیسے بیاں ہو مجھ سے بھلا شانِ مصطفیٰ
قرآنِ پاک خود ہے ثنا خوانِ مصطفیٰ

واللہ اس پہ آتشِ دوزخ حرام ہے
دل سے قبول ہے جسے فرمانِ مصطفیٰ

ہے زیرِ بار روزِ ازل سے ابد تک
ہے ساری کائنات پہ احسانِ مصطفیٰ

سایہ فگن ہے دونوں جہانوں پہ بے گماں
ہے بے کنار وسعتِ دامانِ مصطفیٰ

اس کی تونگری کا ٹھکانہ ہو کیا بھلا
جس کو ملی ہے دولتِ عرفانِ مصطفیٰ

ایفائے عہد دیکھنا چاہے اگر کوئی
دیکھے وہ آ کے وعدہ و پیمانِ مصطفیٰ

جن و ملک حضوؐر کے در کے غلام ہیں
خورشید و ماہ و انجم ہیں دربانِ مصطفیٰ

دہر کے ظلمت کدوں میں روشنی ہے آپؐ سے
ہر طرف امن و سکون و آشتی ہے آپؐ سے

ہے زبانِ حال سے گویا چمن زارِ حیات
باغِ عالم میں بہارِ زندگی ہے آپؐ سے

آپؐ کے دم سے زمین و آسماں کی رونقیں
یہ جہاں بھی وہ جہاں بھی دیدنی ہے آپؐ سے

جائیں تو جائیں کہاں دامانِ رحمت چھوڑ کر
ہم کو اُمیدِ نجاتِ اُخروی ہے آپؐ سے

قیصر و کسریٰ کے محلوں میں دراڑیں پڑ گئیں
لرزہ بر اندام شانِ خسروی ہے آپؐ سے

دونوں عالم میں کہاں اس کا کوئی نعم البدل
مجھ کو حاصل جو متاعِ سرخوشی ہے آپؐ سے

آپؐ کے انوار سے روشن نجوم و ماہتاب
مہرِ عالم تاب میں تابندگی ہے آپؐ سے

کیوں نہ ہو خورشید میرے شعر میں سوز و گداز
میرے جذب و فکر کی وابستگی ہے آپؐ سے

ہوا ہے جب سے تعلق مدینے والے سے
ہوا ہوں دور زمانے کے آہ و نالے سے

ہوئی ہے آپؐ کی آمد پہ نور کی بارش
بکھر گئے ہیں جدھر دیکھئے اُجالے سے

فصیلِ ظلمتِ شب میں اسیر ہوں مولا
مجھے بھی ایک کرن روشنی کے ہالے سے

یہ میری چشمِ تصور میں کون در آیا
اُتر رہے ہیں دل و ذہن پر اُجالے سے

انہیں حضوؐر کی عظمت کی ہو خبر کیونکر
دل و دماغ پر جن کے پڑے ہیں تالے سے

گناہ گار ہوں پر مدح خوانِ آقا ہوں
وہ بخش دے گا مجھے نعت کے حوالے سے

وہ سرزمین بھی جنت نظیر ہے خورشید
ہے جس زمین کو نسبت مدینے والے سے

سلام

وہ زیرِ خنجر غازی ایسا کہ آج تک ناز کر رہے ہیں
رکوع اُس پر سجود اُس پر قیام اُس پر سلام اُس پر

دھوپ کی بوڑھی کرن کے ساتھ منظر کٹ گیا
شاہ کا لختِ جگر سبطِ نبیؐ، گھر کٹ گیا
دین کی تکمیل کا ہے مرحلہ دریا بھی ہے
ورنہ اُنگلی کے اشارے سے سمندر کٹ گیا
زندگی کو یاد ہے وہ تشنہ مشکیزوں کی پیاس
یاد ہے جو قافلہ خیموں کے اندر کٹ گیا
زندگی کو حوصلوں کی رہگذر پر ڈال کر
دینِ مصطفوی کا مرکز اور محور کٹ گیا
عشق نے تیروں کی جب برسات میں سجدہ کیا
کربلا کی ریت کے ذرّوں کا ہر ڈر کٹ گیا
وقت کی خانہ بدوشی کی طبیعت اور ہے
عشق کی خانہ بدوشی میں قلندر کٹ گیا
پیاس کی بنجر زمیں پر پھول کھلتے دیکھ کر
پانیوں کا حوصلہ ساحل کے اندر کٹ گیا
اِک طرف دریا کا پانی ساحلوں میں قید تھا
اِک طرف قرآن کا ایک اِک سخن ور کٹ گیا

(مرتضیٰ ساجد)

فرماں روائے فکر ونظر غم ہے اس گھڑی
ساکت نگاہِ پیکرِ آدم ہے اس گھڑی
حیرت زدہ شعور کا عالم ہے اس گھڑی
محوِ قیام گردشِ پیہم ہے اس گھڑی
تیغ و سناں ہیں اپنی ہزیمت پہ منفعل
زخموں کی بے نیازی مرہم ہے اس گھڑی
تبدیل ہو گئے ہیں مفاہیم صبر کے
جاگیر حرف وصورت سرخم ہے اس گھڑی
سرِّ یوں فدا ہوا ہے کہ میدانِ کربلا
جتنا بھی اس پہ ناز کرے کم ہے اس گھڑی
ہر شخص کٹ مرے گا ضمیرِ حسینؑ پر
کب زندگی کسی کو مقدم ہے اس گھڑی
بیٹھی ہوئی ہے تھام کے سر منطقیں تمام
ہر فلسفے کی چشمِ دروں نم ہے اس گھڑی

(سرور ارمان)

حسینؑ ابنِ علیؑ کی ذات بابرکت کا صدقہ ہے
کمالِ شرفِ انسانی حسینیت کا صدقہ ہے
ادا کردہ ہے جو کرب وبلا کے ریگزاروں میں
مرا طالع اسی کردار کی عظمت کا صدقہ ہے
کیا شبیرؑ نے بامِ وفا کو آشنا جس سے
ہر اک معراجِ ہستی کی اُسی رفعت کا صدقہ ہے
ہوا مظہر ہلالِ استقامت جس کا نیزے پر
طلوعِ آفتابِ صدق اُس رویت کا صدقہ ہے
عطا کی جو بنی نوعِ بشر کو ابنِ حیدرؑ نے
سرافرازی صداقت کی اُسی قامت کا صدقہ ہے
بجھانا جانتے ہیں پیاس اپنی تشنہ کامی سے
یہ خاصہ بھی اُسی مکتب کی تربیت کا صدقہ ہے
رہی ہے آلِ پیغمبرؐ سے جو جعفر حسن مجھ کو
سبھی کچھ میرے دامن کا اُسی نسبت کا صدقہ ہے

(جعفر حسن مبارک)

زمیں حسینؑ کی ہے، آسماں حسینؑ کا ہے
رضائے حق سے یہ کون ومکاں حسینؑ کا ہے
شہید کون یوں کروائے شیر خواروں کو
بدل زمانے میں کوئی کہاں حسینؑ کا ہے
وہ کیوں نہ مرتبے پائیں شہنشہوں سے بڑے
وہ جن کے، نام ہی وردِ زباں حسینؑ کا ہے
تمازتیں ہمیں سورج کی کیا ڈرائیں گی
ہمارے سر پہ بھی اب سائباں حسینؑ کا ہے
تمام بیبیاں شامل ہیں ننگے سر اس میں
رواں جو شام کو یہ کارواں حسینؑ کا ہے
یہ میری چھت پہ جو عباسؑ کا علم ہے اسد
مکین اس میں کوئی ہو مکاں حسینؑ کا ہے

(اسد رضوی)

صورت حسینؑ کی ہو یا سیرت حسینؑ کی
آقا سے کس قدر ہے شباہت حسینؑ کی
کتنے ہیں خوش نصیب نثارانِ کربلا
ان کو میسر آئی رفاقت حسینؑ کی
کیا غم، جنہوں نے جان گنوائی امامؑ پر
دُنیا حسینؑ کی ہے تو جنت حسینؑ کی
گر جاتا آسمان یزیدی سپاہ پر
اُس کو تو چاہیے تھی اجازت حسینؑ کی
روتی نہیں ہیں اور کسی کے لیے کبھی
آنکھیں ہیں میری جیسے امانت حسینؑ کی

اشکوں سے بھیگ جاتا ہے آنچل مرا تمام
کرتی ہوں روز میں بھی تلاوت حسینؑ کی
کیا اور چاہیے مجھے دُنیا میں سعدیہ
حاصل ہو جائے گر مجھے نسبت حسینؑ کی

(سعدیہ سیٹھی)

جگنو، چراغ، صبح کا تارا حسینؑ ہیں
ہر روشنی کا پہلا حوالہ حسینؑ ہیں
ہر دور ہے یزید مظالم کی داستاں
ہر دور میں غریبوں کے مولا حسینؑ ہیں
مر کے بھی زندہ رہتی ہے اُلفت حسینؑ کی
حبِ نبیؐ کا لازمی حصہ حسینؑ ہیں
آنسو گواہ ہیں اپنی محبت کے اے ندیم
صدیوں کے بعد آج بھی زندہ حسینؑ ہیں

(ابرار ندیم)

یاد پیاسوں کی جو آئی تو نہ ٹھہرا پانی
اشک بن بن کے مری آنکھ سے ٹپکا پانی
داستانِ غمِ شبیرؑ سنائی جب بھی
میں نے پتھر سے بھی رِستے ہوا دیکھا پانی
وائی کوثر و تسنیم نے چاہا ہی نہیں
پھوٹ سکتا تھا اُسی دشت سے میٹھا پانی
عرش کی سمت نظر کی مگر اتنا ہی کہا
میں نے اپنے لیے مالک نہیں مانگا پانی
تیری دہلیز پہ دیتے ہیں سلامی بادل
تیری پوشاک پہ جبریلؑ نے چھڑکا پانی
میری نس نس میں محبت کے ہیں پھوٹے چشمے
آنکھ میں تیری عقیدت کا سمایا پانی
جب سے پیاسے نے کیا کوچ جہاں سے عابد
تب سے شبیرؑ پہ روتا ہے یہ پیاسا پانی

(رائے عابد)

کوفے میں بھی حیدرؑ کے پرستار ہیں ہم
وہ جو بھی سزا میثم طمار ہیں ہم
بیعت نہ طلب کرنا کبھی ہم سے یزیدو
باطل کے لیے جرأت انکار ہیں ہم
آنکھوں میں بھرے شام غریباں کی سیاہی
ادراک و بصیرت کے طلبگار ہیں ہم
اپنوں کے لیے نرم طبیعت ہے ہماری
دشمن پہ برستے ہوئے انگار ہیں ہم
پلکوں کی صفوں میں ہیں ستاروں کے سیاہی
کہتے ہیں کہ زہرہؑ کے عزادار ہیں ہم
ہم سوگ میں تو ہیں ہی مگر برسر پیکار
تہذیب عزاداری کے افکار ہیں ہم
ہم کو نہ مٹا پائے کبھی ظالم و جابر
حق گوئی کی ہر دور میں للکار ہیں ہم

(شبہ طراز)

نبیؐ کا صحن چھوڑ کر
جو کربلا میں جا بسے
جو سطوتِ یزید سے بے خانماں نہیں دبے
وہ جرأتوں کے نامہ بر
اُنہیں مرا سلام ہو
کمال اُن کا حوصلہ
وفا سے جو جڑے رہے
مثال اُن کا صبر تھا وہ جن کے بازو کٹ گئے
وہ روشنی کے ہم سفر
اُنہیں مرا سلام ہو
وہ جن کا پانی بند تھا
وہ جن کے خیمے جل گئے
ہیں وہ جمالِ زندگی جو موت سے نہیں مٹے
ہے جن سے دین معتبر
اُنہیں مرا سلام ہو
تھا انقلاب کی بنا
حسینؑ کا وہ کارواں
وہ جن لبوں سے حرفِ حق نہ موت سے بھی چھن سکے
وہ نیزوں کی انی پہ سر
اُنہیں مرا سلام ہو
اُنہیں مرا سلام ہو

(عامر بن علی)

کرم کے بادل برس رہے ہیں دوام اُس پر سلام اُس پر
سلام اُس پر کہ فیض رب کا ہے عام اُس پر سلام اُس پر
وہ شاکر ایسا، لٹے کے اپنا گھرانہ، کرتا ہے شکر اس کا
وہ صابر ایسا کہ صبر کا اختتام اُس پر سلام اُس پر
بہادر ایسا، ذہین ایسا کہ یاد تازہ ہوئی علیؑ کی
حسین ایسا، حسینؑ جچتا ہے نام اُس پر سلام اُس پر
وہ زیرِ خنجر نمازی ایسا کہ آج تک ناز کر رہے ہیں
رکوع اُس پر، سجود اُس پر، قیام اُس پر، سلام اُس پر
وہ ایسا مسند نشیں کہ جسکیں خراج دے کر گزر رہی ہیں
غریب ایسا کہ آئی غربت میں شام اُس پر، سلام اُس پر
یہ سانس چلتا رہے گا جب تک، یہ دل دھڑکتا رہے گا جب تک
حسن میں پڑھتا رہوں یونہی، سلام اُس پر، سلام اُس پر

(حسن عباسی)

شریف خواتین اور غزل

عطاء الحق قاسمی

شاعری میں غزل کی صنف خود ہمیں بری طرح کھٹکا کرتی تھی، کیونکہ اس میں خواتین کے حسن و جمال کے تذکرے ہوتے تھے۔ بلکہ غزل کے شاعروں نے تو پردہ دار بیبیوں تک کو نہیں بخشا اور اس طرح کے شعر کہے کہ

داورِ حشر مرا نامہ اعمال نہ دیکھ!
اس میں کچھ پردہ نشینوں کے بھی نام آتے ہیں

چنانچہ ہم دعا کیا کرتے تھے کہ یا خدا، کوئی ایسا بندہ خدا بھیج جو ان شعراء کا "کلو" نچیپے، سو خدا نے ہماری سنی اور اصغر بن ابراہیم نامی ایک شخص کو یہ توفیق دی کہ وہ ساری کلاسیکی اور آج کی غزل پر جھاڑو پھیریں اور یوں شاعری کے صحن کی صفائی کریں۔ ہم نے ان صاحب کا مضمون "شریف خواتین تغزل کی غلط روش کے خلاف آواز اٹھائیں" کے عنوان سے آج ہی ایک اخبار میں پڑھا ہے۔ موصوف نے اپنے مضمون میں لکھا ہے کہ "بلاشبہ غزل دائرہ اسلام سے خارج ہے" نیز یہ کہ "یہ تغزل ہی کا نتیجہ ہے کہ عورتیں اپنی تعریف سننے کے لئے بے پردگی کی طرف مائل ہو رہی ہیں" چنانچہ اصغر بن ابراہیم صاحب نے "نیک سیرت عورتوں کا دینی فریضہ" یہ بتایا ہے کہ "وہ تغزل کی اس غلط روش کے خلاف آواز اٹھائیں" موصوف کے اس نقطہ نظر سے کسی صاحب کو یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ چونکہ انہیں خود شعر کہنا نہیں آتا، لہذا انہوں نے تمام شاعروں کے لئے اسے حرام قرار دے دیا ہے کیونکہ انہوں نے مضمون کے شروع ہی میں یہ وضاحت کر دی ہے کہ وہ بھی شعر کہا کرتے تھے مگر احسان دانش مرحوم اور جناب عبدالکریم ثمر نے انہیں "ایک خاص نصیحت فرمائی کہ فن شاعری میں اصلاح کی نسبت مجھے مطالعہ کی ضرورت ہے۔ اور اس بات پر زور دیتے ہوئے یہ بھی نشاندہی کی کہ اگر مطالعہ خوب ہو جائے تو مجھے شعر گوئی میں کوئی خاص دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا!" ان صاحبانِ فن کا اشارہ غالباً اس طرف تھا کہ وہ کلاسیکی شاعری کا مطالعہ کریں، مگر اس کی بجائے انہوں نے شاعری کے عدم جواز کے لئے شرعی دلائل ڈھونڈنے کی خاطر مطالعے کا آغاز کیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ اگرچہ قرآن و حدیث میں شاعری کی واضح ممانعت نہیں ہے، تاہم یہ جو غزل کی صنف ہے یہ بہر حال دائرہ اسلام سے خارج ہے کیونکہ اس میں "عورتوں سے باتیں" کی جاتی ہیں، لہذا انہوں نے شعر گوئی ترک کی اور "شریف خواتین" سے کہا کہ وہ ان کی ہم نوائی میں تغزل کی غلط روش کے خلاف آواز اٹھائیں۔

جیسا کہ ہم نے کالم کے آغاز میں کہا کہ خود ہمیں بھی غزل کی یہ صنف زہر لگتی ہے کیونکہ اس میں صنفِ نازک کے حسن و جمال کا بیان ہوتا ہے بلکہ اسکی آڑ میں جو گل کھلائے جاتے ہیں، وہ بھی ہمارے علم میں ہیں۔ ہمارے ایک شاعر دوست جو زمانہ طالب علمی میں اسلامی جمعیت طلبہ سے وابستہ تھے۔ ایک بار کسی خاتون کے ساتھ سینما ہال میں دیکھے گئے، چنانچہ رپورٹ ہونے پر ان کی پیشی جمعیت کی ہائی کمان کے سامنے ہوئی اور کہا گیا "ہمیں معلوم ہوا ہے کہ آپ گزشتہ روز ایک بہن کے ساتھ فلم دیکھتے پائے گئے ہیں!" ہمارے دوست نے اس کے جواب میں اپنی صفائی پیش کی اور کہا "جناب ہماری ایک عزیزہ فیصل آباد سے آئی تھی، وہ فلم دیکھنا چاہتی تھیں، چنانچہ گھر والوں کی ہدایت پر میں انہیں فلم دکھانے چلا گیا تھا!" یہ سن کر انہوں نے کہا "ٹھیک ہے مگر جماعت کا نظم بھی کوئی چیز ہے!" اس پر ہمارے دوست نے کہا "نظم اپنی جگہ، مگر آخر غزل بھی کوئی چیز ہے" خیر یہ تو یونیورسٹی کے ایک طالب علم کی طفلانہ شوخی تھی مگر غزل کا شاعر خواہ باریش ہو اور عمر کے کسی بھی سٹیج پر ہو، حسن و جمال سے منہ نہیں موڑتا! اب اپنے مولانا حسرت موہانی ہی کو دیکھیں، برصغیر کے مسلمانوں کے چوٹی کے رہنماؤں میں سے تھے شرعی حلیہ شرعی وضع قطع، پابند صوم و صلوۃ متقی اور پارسا، باقاعدگی سے گیارھویں شریف دینے والے مگر جب غزل کہتے تھے تو

وہ ترا کوٹھے پہ ننگے پاؤں آنا یاد ہے

اور:

دُکھتی رہی جوان کی کلائی تمام شب

قسم کی غزلیں کہتے تھے چنانچہ ایک بار مولانا سے پوچھا گیا کہ غزل میں تین رنگ ہوتے ہیں ایک فلسفیانہ ایک عاشقانہ اور ایک فاسقانہ، آپ کس انداز کی غزل کہتے ہیں؟ مولانا نے اپنی مخصوص باریک سی آواز میں جواب دیا "فاسقانہ!" اور اس رنگ سخن کی جھلک تو ہمیں کہیں کہیں مولانا ماہرالقادری اور مولانا نعیم صدیقی کی شاعری میں بھی نظر آتی ہے!

ہم یہ سطور یہاں تک لکھ چکے تھے کہ خیال آیا ہم کس کام میں پڑ گئے ہیں، کیونکہ ادھر تو آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے یعنی غزل پر کیا منحصر ہے، اردو اور فارسی کی بیشتر شاعری اصغر بن ابراہیم اور ہمارے قائم کردہ اخلاقی معیار کے لحاظ سے دریابرد کرنے کے قابل ہے اور اکیلے مولانا حسرت موہانی کا کیا ذکر، ادھر تو بڑے بڑے علما، صلحا، صوفیا اور اولیا نے بھی شعروں میں ایسی ایسی باتیں کہی ہیں کہ ہمارے اور اصغر بن ابراہیم جیسے چھوئی موئی لوگوں کے کانوں کی لویں سرخ ہو جاتی ہیں، چنانچہ حضرت امیر خسروؒ مولانا رومؒ اور شیخ سعدیؒ جیسے اکابر کی کئی چیزیں ان دنوں ہمیں لحاف میں چھپا کر پڑھنی پڑتی ہیں۔ حکیم الامت علامہ اقبالؒ بھی،

نہ آتے ہمیں اس میں تکرار کیا تھی

مگر وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی

جیسی غزلیں اور "...... کی گود میں بلی دیکھ کر" ایسی نظمیں کہتے رہے ہیں اور یہ "سلسلہ جاریہ" ابھی تک "جاری" ہے، چنانچہ پچھلے ہفتے خانقاہ گولڑہ شریف کے صاحب زادہ نصیر الدین نصیر مدظلہ العالیٰ غریب خانے پر تشریف لائے تو انہوں نے ہمیں جوش کے رنگ میں کہی ہوئی اپنی ایک نظم "گلبدنی" کے چند بند سنائے اور یہ بند سن کر حسب معمول ہمارے کان کی لویں ایک بار پھر سرخ ہو گئیں، ہم اور برادرم اصغر بن ابراہیم دونوں بہت شرمیلے ہیں!

تاہم اس کالم میں مقصود خود کو شرمیلا اور دوسروں کو شرمیلا ٹیگور ثابت کرنا نہیں، بلکہ صرف اصغر بن ابراہیم کو اپنی حمایت کا یقین دلانا ہے اور ان کی ہمت بندھانی ہے کہ وہ غزل کے خلاف اپنی تحریک کو آگے بڑھائیں تاکہ باقی شریف خواتین بھی ان کی ہم نوائی میں تغزل کے خلاف آواز اٹھائیں۔ البتہ اس سلسلے میں ایک چھوٹی سی رکاوٹ یہ ہے کہ ماضی اور حال میں انتہا درجے کی شریف خواتین خود غزل کہتی رہی ہیں۔ مثلاً اورنگ زیب عالمگیرؒ کی ایک پردہ نشین بیٹی غزل کی نہایت خوب صورت شاعرہ تھیں۔ میر کی صاحب زادی غزل کہتی تھیں۔ اور آج ادا جعفری تک کتنی ہی نیک اور شریف بیبیاں غزل کہتی ہیں، سو کہیں ایسا نہ ہو کہ اس تحریک کی مخالفت سب سے پہلے شریف بیبیوں ہی کی طرف سے ہو۔ اگر ایسا ہوا تو بھی ہم اصغر بن ابراہیم کے ساتھ ہیں کیونکہ ہم ان شاعروں سے بہت تنگ آئے ہوئے ہیں جو آج کے اس سائنسی دور میں بھی انسان اور اس کے حُسن و جمال کے گیت گاتے ہیں چنانچہ اصغر بن ابراہیم کو اپنی تحریک کے سلسلے میں شریف بیبیوں کی حمایت حاصل نہ ہو، تو بھی وہ دل چھوٹا نہ کریں کیونکہ ہم ایسے مرد بہر حال ان کے ساتھ ہیں۔

عطاء الحق قاسمی

بجھتی ہوئی آنکھوں میں اُجالا نظر آیا
خوابوں میں کوئی خواب سا چہرہ نظر آیا

دیکھا ہی نہیں میں نے اگرچہ کبھی اس کو
جب میں نے اسے دیکھنا چاہا، نظر آیا

بھول آیا تھا روتی ہوئی آنکھیں میں وہی پر
جس روز گلستاں میں وہ ہنستا نظر آیا

یک رنگ نظاروں سے الگ خواب نگر میں
تجھ سا نظر آیا ہے نہ مجھ سا نظر آیا

میں بھول چلا تھا در و دیوار تمنا
پھر ایسے ہوا وہ رُخِ زیبا نظر آیا

جو شمع کی صورت نظر آیا شبِ غم میں
صحرا میں وہی صورتِ دریا نظر آیا

درویش ہو سلطان ہو یا صوفی و ملا
یاں جو بھی ملا طالبِ دنیا نظر آیا

جھانکا جو کبھی روزنِ دیوار سے تو نے
اے چشم تماشا تجھے کیا کیا نظر آیا

اس جیسا ابھی تک تو مری عمرِ رواں میں
چہرہ نظر آیا نہ سراپا نظر آیا

دیکھیں گے عطاؔ اس سے رہ و رسم بڑھا کر
وہ شہرِ نگاراں میں الگ سا نظر آیا

سرخ لہلہاتے گلاب

حافظ مظفر محسن

آج صبح موسم بہت خوبصورت تھا۔ ہوا کے جھونکے دل کو لبھا رہے تھے مگر گھر کا ماحول خوشگوار نہ تھا۔

”ماما...... میں آج بہت اداس ہوں اور میں آج اسکول بھی نہیں جاؤں گا؟“۔

”کیوں بیٹا...... خیر تو ہے“

یہ اس قدر تبدیلی...... میں نے تو اس سے پہلے بھی کبھی تمہیں ضد کرتے نہیں دیکھا...... اور وہ بھی اسکول جاتے وقت؟“۔

”اس سے پہلے میرے ساتھ ایسا ہوا بھی تو نہیں“ احمد نے بُرا سا منہ بناتے ہوئے...... غصے میں کہا۔ ”کیا ہو گیا“...... احمد کے دادا بھی مسجد سے واپس آ گئے صبح کی نماز ادا کر کے۔

”یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں احمد بیٹا...... اس قدر کیوں غصے میں لگ رہے ہو۔ جو بھی مسئلہ ہے آ کے حل کر لینا۔ فی الحال تو اسکول جاؤ ناں پلیز“۔

دادا جان نے احمد کے سر پر ہاتھ رکھ کر محبت سے کہا۔ دادا جان...... جو گلاب کا پودا میں نے کل خریدا تھا۔ مالی نے کہا تھا کہ اس پر کل پھول کھلیں گے مگر اس پر تو کوئی بھی پھول نہیں کھلا۔ سر سکندر کی آج سالگرہ ہے اور میں نے سوچا تھا میں آج گلاب کے اس پودے پر کھلنے والا پھول لے کر اسکول جاؤں گا اور سر سکندر کو وِش کرتے ہوئے گلاب کا یہ تروتازہ پھول بھی پیش کروں گا...... کیونکہ وہ ہمیں بہت محبت سے پڑھاتے ہیں اور مزے دار کہانیاں بھی سناتے ہیں۔

”ہاہا...... ہاہا“ دادا کی ہنسی نکل گئی۔

”چٹ منگنی پٹ بیاہ“ وہ بولے

کیا مطلب...... مجھے تو یہ مشکل محاورہ آپ کے دوسرے محاوروں کی طرح پھر نہیں سمجھ آیا۔ احمد نے حیرت سے کہا۔

اصل میں اسے کہتے ہیں ہتھیلی پر سرسوں جمانا“ اوہو“...... ”دادا جان...... پھر سے اِک اور مشکل محاورہ“۔ توبہ اتنے مشکل محاورے۔ احمد نے سر پکڑ لیا۔ غصے سے اُس کا چہرہ لال ہو گیا۔

اچھا چلو...... میں تمہیں اک چھوٹی سی مثال دے کر بات سمجھاتا ہوں۔ دادا جان بولے۔

اُنہوں نے احمد کو بازو سے پکڑ کر اٹھایا اور کمرے میں پڑی لوہے کی الماری میں شہادت کی انگلی کے ناخن سے سوراخ کرنے کو کہا۔ ”تمھارے پاس اس کام کے لیے ایک گھنٹے کا وقت ہے۔

احمد نے ناخن سے آہستہ آہستہ انگلی کی مدد سے الماری کو رگڑنا شروع کیا۔ جب کچھ نہ بنا تو زور زور سے لوہے کی الماری کو ناخن سے چھیلنے کی کوشش کرنے لگا۔ یہاں تک کہ ناخن تھوڑا سا ٹوٹ گیا۔ مگر الماری کا پینٹ تک نہ اتر پایا۔ اس میں سوراخ ہونا تو بہت دُور کی بات تھی۔ دادا جان یہ سارا عمل دیکھ رہے تھے۔ نہایت سنجیدگی کے ساتھ۔

”دادا جان میری انگلی زخمی ہو جائے گی...... اس نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے التجا کی!“۔

بیٹا تم سو سال بھی روزانہ صبح اُٹھ کے ناخن کی مدد سے اس لوہے کی الماری میں سوراخ کرنا شروع کرو رات ہونے پر سو جاؤ اور صبح اُٹھ کے پھر سے اسی کام پر لگ جاؤ مگر کبھی بھی یہ سوراخ نہ ہو پائے گا۔ انگلی تو شاید زخمی ہو جائے کیونکہ یہ ایک غیر فطری کام ہے۔ فطرت کا تقاضہ ہے کہ لوہے کی الماری میں اگر سوراخ کرنا ہے تو اُس کے لیے اوزار سے مدد لو اور سیکنڈز میں یہ سوراخ ہو جائے گا۔ کوئی مشکل بھی محسوس نہ ہوگی۔

ایسے ہی فطرت کا تقاضہ ہے کہ پودا لو...... اُسے صبح و شام پانی دو۔ زمین میں ”گوڈی“ کر دو تاکہ ہوا کا گزر ہو، روشنی داخل ہو...... پودے کی گویا خوراک کا انتظام بھی ہو جائے۔ یہ کام اللہ کا نام لے کر کرتے چلے جاؤ۔ یہاں تک کہ نئے پتے نکلیں گے۔ ان بہت سے نئے پتوں میں سے ننھی مُنی کونپل نمودار ہوگی۔ وہ کونپل دو تین دن میں بڑی ہو جائے گی۔ پانی دینے کا عمل اُسی طرح جاری رہے گا جس طرح ہم روزانہ کھانا کھاتے ہیں، دودھ پیتے ہیں۔ ایسے ہی گویا پودے کو خوراک ملتی رہے گی۔ جیسے دودھ پیتا بچہ وقت کے ساتھ ساتھ خوراک کی مدد سے بیٹھنے اور پھر کھڑا ہونے لگتا ہے اور پھر اک سہانی صبح جب تم بیگ گلے میں لٹکائے اسکول جانے لگو گے تو...... تمہارا دل خوشی سے جھوم اٹھے گا۔ تمھاری آنکھیں محبت سے چمکنے لگیں گی کہ گلاب کا ایک پھول پودے پر ہوا سے لہلا رہا ہوگا، بھینی بھینی خوشبو کے ساتھ! کیونکہ یہ ایک فطری طریقہ ہے۔

احمد کے چہرے پر خوشی کے اثرات نمایاں تھے۔ اُس نے بیگ گلے میں لٹکایا، مسکراتے ہوئے امی کو سلام کیا...... دادا جان سے ہاتھ ملایا اور اپنے خریدے گلاب کے پودے کو محبت سے دیکھتے ہوئے اسکول کی جانب چل نکلا۔

جہاں دادا جان گلاب کے نئے خریدے پودے کو پانی دے رہے تھے۔ نہایت محبت کے ساتھ یہ اُمید لیے کہ چند دنوں میں اس پودے پر نہایت خوبصورت خوشبودار سرخ گلاب لہلانے لگیں گے!۔

ہائے اور با!

افتخار مجاز

یہ گئے دنوں کی باتیں اور بیتے دنوں کا قصہ ہے۔ 78-1977 جنرل ضیاء الحق کا مارشل لاء عہد تھا۔ زبان واظہار کے ہر ذریعے پر کڑے پہرے اور پابندیاں تھیں۔ سخت ترین سنسر شپ عائد تھی۔ اخبارات و جرائد اشاعت سے پہلے جڑی ہوئی کاپیوں کی صورت میں سنسر کے لیے پیش کیے جاتے تھے۔ متعلقہ حکام جس خبر، مضمون، کالم، اداریے یا شعری تخلیق پر معترض ہوتے اُسے جڑی ہوئی کاپی سے اُکھاڑ لیا جاتا اور پھر بقیہ مواد اشاعت کے لیے جازت پاتا۔ اس صورت میں شائع ہونے والے خبارات و جرائد اور رسائل جب منصۂ شہود پر آتے ور قارئین کے ہاتھوں میں پہنچتے تو سنسر کے لیے کھاڑی گئی خبروں اور مضامین کے مقام سے یہ پرچے Blank یا خالی ہوتے۔ مجھے یاد پڑتا ہے اور اخبارات جرائد کی فائلیں شاہد ہیں کہ بعض اخبارات کے آدھے آدھے صفحات خالی اور بلینک ہوتے۔ بات کسی دوسری طرف نکلنے سے روکنے کے لیے براہ راست اُس واقعے کی طرف آتا ہوں جسے آپ سے شیئر کرنے کا بنیادی مقصد صرف یہ بتانا ہے کہ یہ سنسر کی ڈیوٹی پر مامور لوگ بھی زعم خود عجیب وغریب قسم کے دانشور ہوتے ہیں۔ ان کے سنسر کے لیے قائم کیے گئے معیار اور انداز بھی بڑے ''معرکتہ الارا'' قسم کے ہوتے ہیں۔ اِدھر لکھنے والوں کا بھی یہ کمال ہوتا ہے کہ وہ بین السطور یا تکنیکی مہارت کے ساتھ اپنی بات بالآخر کہہ جانے یا Communicate کرتے ہوئے ان کی آنکھوں میں دُھول جھونک ہی جاتے ہیں۔ مگر یہاں میرا موضوع فی الوقت سنسر اور مواد کے نفس مضمون Content کو پاس فیل کرنے کا اختیار رکھنے والوں کی دانش وری، فہم اور ادراک کا تذکرہ کرنا ہے جسے آپ یقیناً دلچسپ اور حماقتوں سے لبریز پائیں گے۔

78-1977 کے مارشل لاء متذکرہ بالا سخت سنسر نافذ ہونے کے دنوں میں میں پنجاب یونیورسٹی میں ایم اے صحافت کا طالب علم تھا اور محض اپنے شوق کی خاطر لاہور سے شائع ہونے والے ایک روزنامہ صداقت میں ادارتی صفحہ ترتیب دیا کرتا تھا۔ مذکورہ پرچے کے ایڈیٹر جناب ظہور عالم شہید تھے۔ جبکہ یہاں دیگر سینئر لوگوں میں جناب اکرام رانا، قمر تسکین، عبدالقدیر نعمانی، م-ش، خالد کاشمیری، نصر اللہ غلزئی وغیرہ شامل تھے۔ یہاں میں ہفتہ میں ایک مرتبہ ادبی صفحہ بھی پیش کیا کرتا تھا۔ اُن دنوں صدر جنرل ضیاء الحق لاہور تشریف لائے تو جناب اشفاق احمد (تلقین شاہ) سے اُن کی ایک تفصیلی ملاقات ہوئی جس میں جناب اشفاق احمد نے دیگر باتوں کے علاوہ جنرل صاحب کو اپنا یہ مشہور نظریہ بھی پیش کیا کہ اس ملک کو نقصان پڑھے لکھوں نے پہنچایا ہے ان پڑھوں نے نہیں۔ مجھے اس نقطہ نظر سے اختلاف تھا۔ میں نے اپنے ادبی صفحہ میں اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے اس پر ایک کالم لکھا اور عنوان باندھا ''ضیاء الحق لطیفے سن رہے ہیں'' معمول کے مطابق جب صفحہ مذکور اشاعت سے پہلے سنسر کے لیے گیا تو یہ کالم سنسر کی زد میں آ گیا اور یوں میرا کالم اُکھاڑ لیا گیا اور یہ جگہ خالی Blank شائع ہوئی جس کا مجھے قلق ہوا۔ چنانچہ میں نے آئندہ ہفتے وہی کالم لے آؤٹ اور سرخی تبدیل کرکے دوبارہ ادبی صفحہ کی زینت بنا دیا۔ اس مرتبہ کالم کا عنوان لکھا ''صدر ضیاء اور اشفاق احمد کی لطیفہ بازی'' صفحہ مذکور اس مرتبہ بھی سنسر کے لیے گیا تو حسب سابق پھر میرا یہ کالم سنسر کی نذر ہو گیا۔ اب میرا ڈھیٹ پن ملاحظہ کیجیے کہ تیسرے ہفتے میں نے پھر وہی کالم ایک نئی ہیڈ لائن ''صدر ضیاء قوم کی فکری راہنمائی کر رہے ہیں'' کے عنوان سے ادبی صفحہ شامل کر دیا۔ آپ یقین کیجیے اور ریکارڈ شاہد ہے کہ مذکورہ کالم من وعن شائع ہو گیا۔ اب آپ خود اندازہ لگا لیجیے کہ لکھنے والوں کا رویہ اور طریقہ کار کیا ہوتا ہے اور سنسر والوں کی دانش وری کیا کیا رنگ دکھاتی ہے۔

مذکورہ بالا طویل قصہ کہانی ہمیں دراصل ایک ٹیلی ویژن چینل پر محب گرامی عطاء الحق قاسمی کی زبان سے یہ واقعہ سن کر یاد آئی۔ قاسمی صاحب نے بتایا کہ انہوں نے عہد ضیاء الحق ہی میں بکرا عید پر ایک ڈرامہ ٹیلی ویژن والوں کی درخواست پر لکھا۔ دوسرے روز ٹیلی ویژن کا پروڈیوسر ان کا لکھا ہوا ڈرامہ سکرپٹ واپس لے کر آ گیا کہ یہ On air نہیں جاسکتا۔ وجہ پوچھی تو موصوف نے بتایا کہ آپ نے اس میں قربانی کے بکروں کے جس حلیہ کا ذکر کیا ہے اس میں کئی جگہ مذکور ہے کہ بکروں کی سیاہ آنکھیں سرمے سے مامور ہیں۔ صدر ضیاء الحق کی آنکھیں بھی سیاہ ہیں اور وہ بھی سرمہ لگاتے ہیں۔ لہٰذا یہ واضح طور پر پتہ چلتا ہے کہ بکروں کی مماثلت ضیاء الحق سے قرار دی جارہی ہے یا

یہ تشبیہ صدر ضیاء کی طرف واضح اشارہ دیتی ہے۔ عطاء الحق قاسمی بتاتے ہیں کہ مذکورہ تحریر لکھتے ہوئے واقعتاً مجھے احساس نہیں تھا کہ میری یہ تحریر ضیاء الحق صاحب کے حوالے سے ہے۔ مگر جب میں نے مسترد شدہ ڈرامے کی جگہ نیا ڈرامہ لکھ کر دیا تو اس میں ضیاء عہد کے حوالے سے کئی چیزیں، پہلو اور معاملات سوچ سمجھ کر ارادتاً ضیا عہد کے حوالے سے لکھے۔ مثلاً ایک جگہ پر تحریر تھا کہ ایک صاحب بکرامنڈی عید قربان پر بکرا لینے جاتے ہیں ایک بیوپاری اُنہیں ایک بہت ہی دبلا پتلا کمزور نحیف اور مریل سا دُنبہ دکھاتا ہے اس پر خریدار بیوپاری سے پوچھتا ہے کیا یہ اصلی دُنبہ ہے یا تم نے اسے مار مار کر دُنبہ بنا دیا ہے۔ عطاء کہتے ہیں یہ واضح طور پر اُن دنوں پیپلز پارٹی کے کارکنوں پر ہونے والے بے پناہ تشدد کے حوالے سے میرا جملہ تھا مگر ٹیلی ویژن کے مذکورہ دانشور پروڈیوسر اور دیگر جملہ متعلقین کے سر کے اُوپر سے گزر گیا اور ڈرامہ On air جانے کے بعد کئی لوگوں نے مجھے اس جملے، فقرے اور منظر نامہ لکھنے کی داد دی۔ مگر سمجھ نہیں آئی تو ٹیلی ویژن کے بزعم خود دانشوروں کو۔

مذکورہ پروگرام کے حوالے ہی سے دانشور شاعر اور کمپیئر اعزاز احمد آذر نے ایک دلچسپ واقعہ سنایا۔ کہنے لگے ایک ٹیلی ویژن چینل پر ہلکی پھلکی، دلچسپ گفتگو پر مبنی ایک پروگرام ریکارڈ ہوا۔ جس میں عطاء الحق قاسمی، امجد اسلام امجد اور اصغر ندیم سیّد و ڈاکٹر مہدی حسن جیسے دانشور شریک تھے۔ بات چلتے چلتے سکھوں کی ظرافت اور حماقتوں کی طرف جا نکلی۔ چنانچہ ایسے میں میں نے ایک سکھ کا یہ دلچسپ لطیفہ سنایا۔ اب باقی بات اُنہی کی زبانی ملاحظہ کیجیے۔

سکھ سردار نے دعویٰ کر دیا کہ وہ رب ہو گیا ہے۔ لوگوں نے اُسے بہت سمجھایا کہ ایسی بات نہیں کرتے مگر سکھ کا اصرار تھا کہ وہ خدا ہے۔ وہ رب ہے اور وہ اپنے رب ہونے کے حق میں دلیل اور گواہ بھی پیش کر سکتا ہے۔ مگر لوگوں نے اُسے بہت مارا۔ اس کے باوجود اُس کا اصرار جاری رہا کہ وہ رب ہے وہ خدا ہے اور وہ اپنے سچا ہونے کی گواہی بھی پیش کر سکتا ہے۔ بات بہت بڑھ گئی تو کسی سیانے نے لوگوں کو مشورہ دیا چلو اس کی پوری بات سن تو لیں اور دیکھیں یہ کون سی گواہی اور دلیل پیش کرتا ہے۔ لوگ اس امر پر آمادہ ہوئے تو سکھ خوش ہو گیا اور کہنے لگا آؤ میرے ساتھ۔ چنانچہ وہ آگے آگے چل پڑا اور لوگوں کا ہجوم اُس کے پیچھے پیچھے جلوس کی صورت۔ کبھی وہ ایک بازار سے گزرتا اور دوسرے کوچے میں داخل ہو جاتا۔ دوسرے کوچے سے وہ تیسرے محلے اور پھر لوگوں کو گلیوں گلیوں لے کر پھرتا پھرتا ایک تنگ و تاریک خستہ حال گندی مندی گلی میں پہنچا۔ اُس کے پیچھے آنے والوں کا برا حال اور تجسس بہت بڑھ چکا تھا۔ یہاں آ کر وہ رُکا۔ پیچھے مڑ کر دیکھا اور ہجوم سے مخاطب ہو کر بولا بھائیو خبردار! دھیان سے سننا، کان کھول لو اور متوجہ ہو جاؤ۔ یہ کہہ کر اُس نے بند گلی کا آخری دروازہ جس پر ٹاٹ کا پردہ پڑا ہوا تھا زور زور سے کھٹکھٹایا اور بغیر انتظار و توقف کیے مسلسل دستک دیتا ہی چلا گیا۔ دروازے پر اس کی دستک جاری تھی کہ دفعتاً دروازے کے دونوں پٹ اندر کی طرف کھلے اور حیرت زدہ چہرے اور غصے کے عالم میں دروازہ کھولنے والی ستر سالہ اماں نے سردار کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ''ہائے! ہائے! او ربا! توں فیر آ گیا ایں'' (ہائے ہائے! اربا، تم پھر آ گئے ہو۔''

مائی کا یہ جملہ سن کر وہ سردار پھر ہجوم کی طرف پلٹا اور بولا اب تو آپ کو یقین آ گیا ہے ناں کہ......

آذر صاحب بتاتے ہیں کہ سردار جی کے اس فہم و ادراک اور ذہنی کیفیت کے بیان پر سب موجود اہل دانش لوٹ پوٹ ہو گئے۔ مگر پروگرام کے محبی دانشور پروڈیوسر یا متعلقہ ''سنسر کنندگان'' نے اس دلچسپ قصے، واقعے یا لطیفے کو ایڈیٹنگ کی نذر کر دیا۔ حالانکہ اس پروگرام کا فارمیٹ اور مقصد ہی تفریح طبع اور دلچسپ و مزیدار واقعات کا بیان و گپ شپ تھا۔

اب اسی پروگرام کا ایک اور قابل توجہ پہلو بھی دیکھیں جو متعلقہ دانشوروں کی نظروں اور فہم سے اوجھل رہا۔ راوی بتاتا ہے کہ دانشور ڈاکٹر مہدی حسن صاحب نے بتایا کہ ان دنوں جہاں وہ پڑھاتے ہیں وہاں انگریزی میڈیم بچے ہوتے ہیں۔ ہم نے ایم اے کی سطح کے طالب علموں کا اردو زبان سے شغف، دلچسپی اور معیار دیکھنے کے لیے اُنہیں چند محاورے دیے کہ وہ ان کا اُردو زبان میں فقروں میں استعمال کریں۔ انہوں نے جو تین محاورے بتائے اُن میں سے ایک محاورہ غم غلط کرنا بھی تھا۔ مہدی صاحب نے بتایا کہ ایک طالب علم نے لکھا ''فاطمہ یونیورسٹی کے تمام لڑکوں کا غم غلط کر دیتی ہے۔'' اب ملاحظہ فرمایئے سنسر اتھارٹی کا کمال کہ جس بات، فقرے یا لفظ کو سنسر یا Edit کرنا چاہیے تھا وہ تو On air چلا گیا اور جو دلچسپ مزیدار اور انجوائے کرنے والی بات یا لطیفہ تھا وہ سنسر کی نذر ہو گیا۔ غالباً اِسے ہی تو کہتے ہیں:

''جو چاہے آپ کا حُسن کرشمہ ساز کرے''

❀❀❀

"ہاتھ دل سے جدا نہیں ہوتا"......ایک تاثر

احمد جلیل/اوکاڑہ

ایک شاعر جب کوئی سفرنامہ لکھے گا تو نثر میں شاعری کرے گا۔ اس امر کا یقین ہمیں حسن عباسی کا سفرنامہ "ہاتھ دل سے جدا نہیں ہوتا" پڑھ کر آیا۔ منظروں کی لفظوں حرفوں میں تصویر کشی کرنا ایک مشکل کام ہے لیکن حسن عباسی نے یہ مشکل کام نہایت آسانی سے کر دکھایا ہے۔ پورے سفر میں قاری اُس کی اُنگلی تھامے اس کے ساتھ ساتھ رہنے پر اس لیے مجبور نظر آتا ہے کہ اس ادبی سفر کی رنگینیاں اور دلچسپیاں کسی مرحلے پر بھی حسن عباسی نے کم نہیں ہونے دیں۔ اُس نے جو کچھ دیکھا اور محسوس کیا اپنے قاری کو من وعن منتقل کر دیا۔ یہی اس ادبی سفرنامے کا حُسن ہے۔ مزید براں یہ کہ مختصر مقامات اور مشاعروں کی تصاویر نے اس سفرنامے کی خوبصورتی کو دو چند کر دیا ہے۔

حسن عباسی سے میری شناسائیاں سالوں پر محیط ہیں۔ وہ خوبصورت اور دل کو چھو لینے والے اشعار تخلیق کرتا ہے۔ جدید غزل میں اس کا ایک نمایاں مقام اور نام ہے۔ اس کی شاعری کو پڑھ کر تازگی کا ایک ایسا احساس جاگزیں ہوتا ہے جو دیگر شعراء کے ہاں خال خال ہی نظر آتا ہے۔ اب تک اس کے تین شعری مجموعے منظر عام پر آ کر علمی ادبی حلقوں میں غیر معمولی پذیرائی حاصل کر چکے ہیں۔ یہ خوبصورت شاعر صرف شاعری پر قانع رہنے کے لیے تیار نہ ہوا۔ وہ نثر کے میدان میں بھی کود پڑا اور شاعری کی طرح اس میں بھی اپنا لوہا منوایا اور اپنا منفرد مقام برقرار رکھا۔ اب تک اس کے تین ادبی سفرنامے منصۂ شہود پر آ کر بے پناہ داد و تحسین کے سزاوار ٹھہرے ہیں۔ زیر نظر مضمون میں، میں اس کے دوسرے سفرنامے "ہاتھ دل سے جدا نہیں ہوتا" کے حوالے سے ہی بات کروں گا۔ یہ سفرنامہ متحدہ عرب امارات کی سیر کا احوال ہے۔

ہم حسن عباسی کی خوبصورت شاعری کے تو معترف تھے ہی، اب کی بار انہوں نے اپنا ادبی سفرنامہ "ہاتھ دل سے جدا نہیں ہوتا" بھجوا دیا۔ میں سوچ رہا تھا کہ پتہ نہیں نثر نگار حسن عباسی کیا ہوگا؟ لیکن جوں جوں میں سفرنامہ پڑھتا چلا گیا خوشگوار حیرتیں مجھے اپنے حصار میں لیتی چلی گئیں۔ سفرنامے میں اس کی نثر نے شاعر حسن عباسی کو کہیں شرمندہ نہیں ہونے دیا۔ مجھے تو اس کا یہ سفرنامہ اس کی نثری شاعری کا شاہکار محسوس ہوا۔ اگر میں یہ کہوں تو غلط نہ ہوگا کہ اس کی نثری شاعری نے مجھے زیادہ لطف دیا۔ اس سفرنامے میں اس کا اندازِ بیان سادہ، سلیس اور دلکش ہے۔ اس کا ہلکا پھلکا اندازِ نگارش تحریر کو کہیں ثقیل نہیں ہونے دیتا۔ حالانکہ اس نے متحدہ عرب امارات کا سارا تاریخی جغرافیہ قاری کو ازبر کرا دیا ہے۔

وہ اپنے قاری کو ہر جگہ اپنے ساتھ ساتھ لیے پھرتے ہیں۔ یہ سفرنامہ پڑھتے ہوئے مجھے کچھ ایسا محسوس ہوا کہ جیسے میں حسن عباسی کا ہم رکاب رہا ہوں۔ قاری کو اس حد تک اپنے سحر میں جکڑنا بلاشبہ حسن عباسی ہی کا کمال ہے۔ یہ اس کا وہ جادو ہے جو جگہ جگہ سر چڑھ کر بولتا نظر آتا ہے۔ دُبئی کی اتنی خوبصورت منظر کشی اس سے پہلے میری نظر سے نہیں گزری۔ اس سفرنامے میں اسے خوابوں کا ایسا شہر بنا کر پیش کیا گیا ہے جہاں ان کی تعبیریں بھی بلاتاخیر ملتی ہیں۔ وہاں سمندر کے پانیوں میں چاند کی بجائے دُبئی شہر کا حُسن جھلملاتا نظر آتا ہے۔ دُبئی میں سمندر اور صحرا آپس میں گلے ملتے نظر آتے ہیں۔ حسن عباسی نے اسے رنگوں اور روشنیوں کا شہر بنا کر پیش کیا ہے۔ جزئیات نگاری سے کسی بھی رائٹر کی فنی مہارت کا پتہ چلتا ہے۔ حسن عباسی نے اس حوالے سے بھی کوئی سقم نہیں رہنے دیا۔

فلک بوس عمارتیں ہوں کہ شاپنگ مال، کشادہ سڑکیں ہوں کہ محلات جیسے گھر، ہر منظر آنکھوں پر ثبت ہوتا چلا جاتا ہے۔ بقول مصنف دُبئی میں آ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ خوابوں کا وہ شہر ہمارے اندر بس گیا ہے جس کے ہم سپنے دیکھتے تھے۔ شہروں میں آ کر لوگ دیہات کی خوبصورتیاں بھول جاتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر شہروں کا کلچر بے وفائی سے عبارت ہے۔ دُبئی جیسے شہر میں وہی لوگ قدم جما پاتے ہیں جو اس پہلو کو مدنظر رکھتے ہیں۔

سفرنامہ پڑھ کر یہ تاثر غالب رہتا ہے کہ حسن عباسی نے متحدہ عرب امارات کی تاریخ اور جغرافیے کا بنظر غائر مطالعہ کیا ہے۔ وہاں کی زندگی کی اتنی بھرپور، رنگین اور مکمل تصویر بہرطور اس کی متقاضی ہے۔ اگرچہ متحدہ عرب امارات کی سات ریاستیں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر ہیں لیکن دُبئی کی بات ہی اور ہے۔ حسن عباسی نے دبئی کو عالمی مشاعروں کے لیے موزوں ترین کہا ہے۔ کیونکہ وہاں چلتی پھرتی غزلیں، بکھری رنگینیاں اور شاعرانہ ماحول غرض وہ سب کچھ یکجا نظر آتا ہے جو کسی بھی مشاعرے کے انعقاد کے لیے ضروری لوازمات ہیں۔ مصنف نے وہاں کے حکمرانوں کا تفصیلی احوال بھی لکھا ہے۔ خاص طور پر شیخ زید بن سلطان النہیان اور دُبئی کے موجودہ حکمران شیخ محمد بن راشد المکتوم کا تذکرہ زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ دُبئی کے علاوہ ابوظہبی کی ترقی میں ان کی کاوشیں بھی قابل قدر نظر آتی ہیں۔

حسن عباسی نے اس سفرنامے میں دو عالمی

مشاعروں کا تفصیلی احوال شاعرانہ انداز میں کچھ اس طرح رقم کیا ہے کہ ہر شاعر کے دل میں یہ اُمنگ جاگ اُٹھتی ہے کہ کم از کم ایک بار وہ وہاں جا کر اس حُسن کا خود نظارہ کرے جس کی نشاندہی مصنف نے اس سفرنامے میں جابجا کی ہے۔ مصنف نے آتشِ شوق بڑھانے کے لیے یہاں تک لکھ دیا ہے کہ بحری جہاز سے دبئی کا نظارہ یوں نظر آتا ہے جیسے کہکشاں زمین پر اُتر آئی ہو۔ اس ادبی سفرنامے میں مشاعروں کے احوال کے علاوہ متحدہ عرب امارات کی ریاستوں بالخصوص دبئی کے تاریخی اور جغرافیائی پس منظر کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ دبئی کے مشہور مقامات مثلاً جمیرا بیچ، برج العرب، مدینۃ الجمیرا، میناء الاسلام، القصر اور نئی تعمیرات میں مرینہ، دی لیکس، دی سپرنگز، دی میڈوز، پام آئی لینڈ قابلِ ذکر ہیں۔

حسن عباسی پرنس اقبال کے ادبی محافل سجانے کے جنون کے بطورِ خاص مداح ہیں۔ عجمان کے فور اسٹار ہوٹل رمادہ میں ایوانِ اقبال کے زیرِ اہتمام منعقدہ مشاعرہ بعنوان "یادیں" ان کے اسی والہانہ شوق کا غماز تھا جو ذہنوں میں خوشگوار یادیں چھوڑ گیا۔ دبئی اور شارجہ کا مضافات نظر آنے والی عجمان کی ریاست متحدہ عرب امارات کی سب سے چھوٹی ریاست ہے لیکن اس کے خوبصورت مقامات نے اسے دوسری بڑی ریاستوں کا ہمسر بنا دیا ہے۔ عطاء الحق قاسمی کی صدارت میں منعقد ہونے والے اس عالمی مشاعرے میں مقامی شعراء کے علاوہ ڈاکٹر انعام الحق جاوید، خالد مسعود، شہزاد نیر، حرا رانا اور مصنف کی موجودگی نے اسے معتبر بنا دیا تھا۔ ظہور الاسلام کی جاندار کمپیئرنگ اور کثیر تعداد میں باذوق سامعین کی موجودگی سونے پر سہاگہ تھی۔

دبئی کا تذکرہ مصنف نے بڑی تفصیل سے کیا ہے۔ دبئی کی قابلِ دید عمارتوں میں 828 میٹر بلند برج خلیفہ جو 160 منزلوں پر مشتمل ہے، کا تذکرہ قاری کو حیرتوں میں ڈال دیتا ہے۔ علاوہ ازیں سکائی دبئی (گرم ترین ماحول میں سرد ترین مقام) ابن بطوطہ مال (جہاں ضرورت کی ہر چیز میسر ہے)، دبئی آٹوڈروم (موٹر سپورٹس سٹیڈیم)، ڈائنامک ٹاور (ہمہ وقت شکلیں بدلنے والی 1380 فٹ بلند عمارت) ایسی جگہیں ہیں جہاں حیرتیں بھی حیرانیوں میں ڈوب جاتی ہیں۔

مصنف نے دوحہ کے عالمی مشاعرے کا احوال بہت تفصیل سے بیان کیا ہے۔ انہوں نے اسلم کولسری کی شخصیت کا پورٹریٹ بہت دل آویز بنا کر پیش کیا ہے۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ وہ ایک مہمان شاعر تو ہیں ہی لیکن اس سے کہیں بڑے وہ انسان بھی ہیں۔ دوحہ کی ریاست کا احوال بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ دوحہ کے معنی بڑا درخت کے ہیں۔ یہ مچھیروں کی بستی رہی ہے۔ اس شہر کی بنیاد 1850ء میں رکھی گئی تھی۔ آج اس شہر کو دیکھیں تو وہ حیرتوں کی سرزمین نظر آتا ہے۔ دوحہ میں عالمی مشاعرے کا انعقاد ملک مصیب الرحمٰن کی شبانہ روز محنتوں کا اعجاز تھا۔ اُردو ادب کے معتبر شعراء، جن میں بشمول مصنف احمد فراز، امجد اسلام امجد، اسلم کولسری، سلیم کوثر، ایوب خاور، پروفیسر عنایت علی خان، گروبندر سنگھ کوہلی، ڈاکٹر عبدالعزیز الکواری، ڈاکٹر اختر شمار، عزم شاکری، عزم بہزاد، صابر رضا، چندر بھان، پروفیسر نثار احمد فاروقی، ندا فاضلی، معراج فیض آبادی، اشفاق حسین، شوکت فہمی، انا دہلوی اور شاہدہ حسن جیسے نام شامل ہیں، نے اس مشاعرے میں اپنے انمول افکار کی خوشبو بکھیری تو پنڈال مہک مہک اُٹھا۔ باذوق سامعین سے کھچا کھچ بھرا ہوا ہال داد و تحسین کے نعروں سے گونجتا رہا۔

اس مشاعرے سے پہلے انعامی تقریب کا احوال بھی مصنف نے بہت تفصیل سے بیان کیا ہے۔

مشاعرے کے بعد امجد اسلام امجد کی سالگرہ ایک اور خوبصورت ادبی تقریب کا بہانہ بنی اور خوب بنی۔

سفرنامے کے آخر میں مصنف نے ایک درد بھری نظم ملک مصیب الرحمٰن، جواب اس دنیا میں نہیں رہے کے لیے لکھی ہے۔ جبکہ دوسری اُن شعراء کے نام ہے جو ہمیں دائمی اُداسیاں اور فرقتیں دے کر راہیِ ملکِ عدم ہو گئے:

"ڈھونڈ اب ان کو چراغِ رُخِ زیبا لے کر"

نثر کی نسبت میں شاعری زیادہ رغبت سے پڑھتا ہوں۔ کسی نثری کتاب کو ایک نشست میں پڑھنا میرے لیے کبھی آسان نہیں رہا لیکن "ہاتھ دل سے جدا نہیں ہوتا" میں نے ایک ہی نشست میں پڑھی اور مجھے احساس تک نہ ہوا کہ میں نثر پڑھ رہا ہوں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ مصنف نے اس نثری کتاب میں شاعرانہ رنگ کہیں پھیکا نہیں پڑنے دیا۔ اس سفرنامے میں حسن عباسی نے اتنا کچھ جمع کر دیا ہے کہ اس مختصر سے مضمون میں اسے سمیٹنا ممکن نظر نہیں آتا۔ یہ تبصرہ لکھ کر مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے کہ جیسے بہت کچھ احاطہ تحریر میں آنے سے رہ گیا ہے۔ یہ رہ جانے والی تشنگی ہی اس کا حُسن ہے۔ شاید یہی تشنگی آپ کو یہ ادبی سفرنامہ پڑھنے پر مجبور کر دے۔ آخر میں اس خوبصورت شاعر اور نثر نگار کو ان الفاظ میں داد و تحسین دینے کو جی چاہتا ہے۔

پھول لگتا ہے کبھی بادِ صبا لگتا ہے
ہائے وہ شخص کہ ہر روز نیا لگتا ہے

حسن عباسی کا یہ ادبی سفرنامہ بلاشبہ اُردو ادب میں ایک خوبصورت اضافہ ہے۔ میں اس دعا پر اپنی بات کا اختتام کرتا ہوں:

"اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ"

متفرق شاعری

نومحرم کی رات لکھی گئی ایک نظم......

چٹائی پر رکھے چائے کے پیالے
اوراُن کی بھاپ سے اُٹھتا میٹھا دُھواں
وہ نیاز کی دال اور باجرے کی روٹی
وہ یاروں کی سنگت
اورمچ کے بلند شعلوں میں بنتی بگڑتی شکلیں
اوراُن کو دھیان میں رکھتا ہوا میں
کبوتروں کی غٹرغوں میں کلمہ طیبہ
اورسلام یاحسینؑ کہتے شام کے پنچھی
میری خاموشی میں رس گھولتے ہیں
یاحسینؑ، یاامام
یہی مری نظم
آپ کے نام

(سیّد علی بابا)

تم سے ملے تو عشق دوبارہ کریں گے ہم
لے کر تمہارا نام پکارا کریں گے ہم
دیکھیں گے ہم کو رشک سے باغ و بہار و گل
اس زندگی کو ایسے گزارا کریں گے ہم
ماتھے پہ رنگِ سبز سے لکھیں گے روشنی
آنسو کو تیرے چھو کے ستارہ کریں گے ہم
بہتے رہیں گے جھیل سی آنکھوں میں دیر تک
آخر تمہارے دل کو کنارا کریں گے ہم
جس دن زمیں کی گرہیں سبھی کھولی جائیں گی
اُس دن تمہیں بھی ایک اشارہ کریں گے ہم
کاؔمی ہمیں جو عشق صحیفہ عطا ہوا
اُس کو پڑھیں گے اور سپارہ کریں گے ہم

سیّد کامی شاہ

شب کو ہم سو گئے فیصلے توڑ کر
خواب پورے کیے رت جگے توڑ کر
ان کا جلنا بچھڑنا تماشا ہوا
آ کے وعدے کیے چل دیے توڑ کر
کرچی کرچی سے خونِ روانی چلا
عکس سب بہہ گئے آئینے توڑ کر
ہم تو کانٹوں سے دست وگریباں رہے
پھول تم لے گئے شاخ سے توڑ کر
سوءِ تخریب مٰیں حُسنِ تعمیر ہے
دل کے شیشے سے جوہر بنے توڑ کر
مجھ کو آ کر چھڑائے گی ماں کی دُعا
غم کی زنجیر کے سلسلے توڑ کر
تم نے ثاقبؔ تعلق اُجاگر کیے
ایک سے جوڑ کر ایک سے توڑ کر

آصف ثاقب

کیا ہوئی تیری روانی پانی
کچھ سنا اپنی کہانی پانی
ریت رہنے دے پڑی ساحل پر
چھوڑ جا اپنی نشانی پانی
دشت تک آ جو گیا بھولے سے
سیکھ لے خاک اُڑانی پانی
پیاس بچے کی جو دیکھی دریا
ہو گیا شرم سے پانی پانی
راہ تکتی ہے ترا مدت سے
اِک گزرگاہ پرانی پانی
تو وہاں آگ لگا آیا ہے
تھی جہاں آگ بجھانی پانی
کیا سے کیا دُھوپ نے حالت کردی
برف کی تو ہے نشانی پانی
ضبط کا آخری پشتہ ٹوٹا
ہر طرف ہو گیا پانی پانی

واجد امیر

بہت بلندی سے پہلے مجھے اُٹھایا گیا تھا
پھر آسمان سے نیچے مجھے گرایا گیا تھا
بسا دیا گیا ہوں پتھروں کی بستی میں
میں جانتا ہوں مجھے آئینہ بنایا گیا تھا
نہیں تھا حرفِ مکرر میں لوحِ دُنیا پر
بڑے خلوص سے پھر بھی مجھے مٹایا گیا تھا
ہمارے قدموں کے اس کو نشاں دکھائے گئے تھے
جنوں کا راستہ جب قیس کو دکھایا گیا تھا
تب اعتبار کی اس کو سند ملی تھی کہیں
جب آئینے میں ترے عکس کو سجایا گیا تھا

یزید وقت کی کتنی ہی کوششوں کے طفیل
ہمارے عہد کو کرب و بلا بنایا گیا تھا
کوئی بھی رستہ نہ چھوڑا تھا اس نے میرے لیے
مجھے دیوار سے کچھ اس طرح لگایا گیا تھا
جلیل تب مری تشکیل نے مجھے ڈھونڈا
زمانوں تک مجھے جب چاک پر گھمایا گیا تھا
میں مل گیا ہوں اسی خاک میں جلیل آخر
مرے خمیر کو جس خاک سے اُٹھایا گیا تھا

احمد جلیل، اوکاڑہ

دلکشی کو نئے معانی دے
تشنہ لب منظروں کو پانی دے
اے ہوائے بہار سی تحریک
بوڑھے اوراق کو جوانی دے
کیا دل افروز تھی شب خوش خواب
صبح تعبیر بھی سہانی دے
نظر آتا رہوں زمانے کو
بے نشاں ایسی اک نشانی دے
تنگ ہے مثل حلقۂ زنجیر
چشم صحرا کو بے کرانی دے
کر کوئی لعل لازوال عطا
دل کو دولت نہ آنی جانی دے
بے زمینوں کے پاؤں دھرنے کو
قطعہ باغ آسمانی دے
موج خواہش ہے انجماد پذیر
تنگ گرم خو روانی دے
ذہن غفلت گزیں دریچے کھول
مت نئے کو پھبن پرانی دے
سُرمہ ہونا ہے اپنا طورِ طلب
جلوے برسا کہ لن ترانی دے
غزنی ہے شہاب سجدہ گزار
مالک الملک رائیگانی دے

شہاب صفدر، اسلام آباد

پھر بھی احسان جتاتے رہے میرے سر پر
دوست الزام لگاتے رہے میرے سر پر
میں تو اپنوں کی نوازش کو مدد سمجھا تھا
اور وہ قرض چڑھاتے رہے میرے سر پر
تیرگی میرے رگ و پے میں اتر آئی ہے
آپ کیا شمع جلاتے رہے میرے سر پر
میں قد آور بھی تھا، سالار بھی اگلی صف کا
تیر دشمن کے سب آتے رہے میرے سر پر
مجھ کو شہزادگی دشت میسر آئی
آئنے تاج سجاتے رہے میرے سر پر

علی یاسر

رزق ذخیرہ کرنے لگے پرندے بھی
دانے کا دم بھرنے لگے پرندے بھی
انسانوں کی صورت اپنے سائے سے
رفتہ رفتہ ڈرنے لگے پرندے بھی
حیرت ہے اب چھوٹی چھوٹی باتوں پر
تو تو میں میں کرنے لگے پرندے بھی
موت کا خوف بھی موت سے کاری ہوتا ہے
وقت سے پہلے مرنے لگے پرندے بھی
زہر ملا ہے کیسا دانے پانی میں
چونچیں خالی کرنے لگے پرندے بھی
پہلے پہل درخت ہی ہم سے شاکی تھے
اب یہ تہمت دھرنے لگے پرندے بھی

مسعود احمد، اوکاڑا

یہ سرد ہوا تو نہیں، آتی ہوئی میں ہوں
اب تیرے رگ و پے میں سماتی ہوئی میں ہوں
بادل کی طرح پیاس بڑھاتا ہوا تو ہے
بارش کی طرح آگ لگاتی ہوئی میں ہوں
سبزہ سا مرے صحن میں اُگتا ہوا تو ہے
شبنم کی طرح خود کو لٹاتی ہوئی میں ہوں
آئینے کی دیوار سا تو ہے مرے آگے
آئینے میں رُوپ اپنا سجاتی ہوئی میں ہوں
باغوں کی طرح مجھ میں یہ پھیلا ہوا تو ہے
کوئل کی طرح تجھ میں یہ گاتی ہوئی میں ہوں
چندا کی طرح مجھ میں سمایا ہوا تو ہے
جھیلوں کی طرح تجھ کو چھپاتی ہوئی میں ہوں

صائمہ ملک

کہیں پہ ٹوٹا ستارا تو آنکھ بھر آئی
خیال آیا تمہارا تو آنکھ بھر آئی
محبتوں کے شب و روز یاد آنے لگے
کہیں ملا وہ دوبارہ تو آنکھ بھر آئی
تمہارے خواب مری ملکیت میں ہوتے تھے
ہوا کسی کا اجارہ تو آنکھ بھر آئی
میں صائمہ کبھی لہروں کبھی بھنور میں رہی
نظر جو آیا کنارا تو آنکھ بھر آئی

صائمہ ملک

افسانہ

اکیلا مکان، اُداسی اور میں

دستگیر شہزاد

اسے مجذوب کی بڑ کہیے یا دیوانے کا خواب!

لیکن میں سوچتا کہ ایک چھوٹا سا ایسا گھر ہو جسے پیٹھ پر لاد کر جہاں چاہوں رکھ سکوں۔ سمندر کنارے، پہاڑ پر، بیابان میں یا پھر لاہور میں جہاں آدمی گھر نہیں خرید سکتا۔ کبھی مرغزاروں میں، کبھی ہائی وے پر کہ چلتے رہو اور منزل نہ آئے۔ ایسا ایک گھر ہو اور ایسی ایک عورت ساتھ رہے جو یہ نہیں کہ بیوی بن جائے۔ وہ بے رشتہ عورت ہو اور کبھی ہر رشتہ تھوڑا تھوڑا نبھائے اور ایسا رشتہ بھی جس کا کبھی وجود نہ تھا اور نہ ہوگا۔

اسے مجذوب کی بڑ کہیے یا دیوانے کا خواب!

لیکن میں سوچتا کہ کبھی میں رانجھا بن جاؤں کبھی بانسری بجاتا کسی ہیر کے لیے جنگل بیلے میں بھینس چراتا پھروں۔ کبھی سورج صبح جنتے ہوئے بالک جیسا نمودار ہو اور تھک کر چور شام کو سمندر میں لال گولے جیسا غڑاپ سے ڈوب جائے۔

اس طرح کے خیالات میں مستغرق میں بیٹھا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا تو سامنے لڑکی کھڑی تھی۔ اس کے کندھے سے بیگ لٹک رہا تھا اور ہاتھ میں کچھ پیکٹ تھے۔

''شاید میں نے آپ کو ڈسٹرب کیا۔''

میں نے اسے ویلکم کہا اور بولا ''تمہارا آنا تو طے تھا۔''

لڑکی چونک گئی۔

میں نے اسے کمرے میں ٹیبل کے پاس پڑی کرسی پر بیٹھنے کے لیے کہا۔ کچن سے چائے کے دو مگ لائے۔ ایک لڑکی کو دیا اور دوسرا خود اپنے ہونٹوں کو لگا لیا۔ اس کی ضرورت کیا ہے۔ لڑکی شاید اپنے کام سے مطلب رکھنا چاہتی تھی۔

''چائے تیار ہے پی لیجیے۔'' میں بولا

لڑکی نے چائے پیتے ہوئے کہا ''میں ڈٹرجنٹ پاؤڈر بیچتی ہوں۔ یہ پاؤڈر گندے سے گندے کپڑے دھو کر صاف کر دیتا ہے۔ ایک دم اُجلا ایسا کہ لوگ آتے جاتے کپڑے کی طرف دیکھ کر حیرت زدہ رہ جاتے ہیں اور انہیں یقین نہیں آتا کہ کپڑے اتنے سفید بھی دُھل سکتے ہیں۔''

میں نے اُداسی کے عالم میں فوراً کہا ''کیا یہ پاؤڈر گناہوں کے داغ دھو سکتا ہے۔''

لڑکی نے میری طرف بغور دیکھا اور جو اس نے سمجھنا چاہا شاید وہ سمجھ گئی۔ لڑکی نے دیکھا کہ کمرے میں کتابوں سے بھری دو الماریاں ہیں۔

اس نے پوچھا ''آپ نے کتابوں کا بڑا ذخیرہ جمع کر رکھا ہے۔ کیا آپ نے ان تمام کتابوں کا مطالعہ کیا ہے؟''

''میں کتابوں سے زیادہ زندگی کا مطالعہ کرتا ہوں''

''بائی دے وے کیا تمہیں مطالعے کا شوق ہے؟''

لڑکی نے منہ بچکایا۔

میں بولا ''میرے والد نے کئی نادر و نایاب کتابیں جمع کر رکھی ہیں۔''

''آپ کے والد کہاں ہیں؟''

''وہ ملازمت کے سلسلے میں گلگت گئے تھے۔ درمیان میں تو کئی بار یہاں آتے رہے لیکن اب برسوں سے نہیں آئے ہیں۔ مجھے لگتا ہے ایسے سفر پر نکل گئے ہیں جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا۔''

لڑکی نے بات کا رُخ موڑتے ہوئے کہا ''دنیا بہت گندی ہے ہماری کمپنی نئی ہے۔ چھوٹی ہے مگر اس کا مقصد بڑا ہے۔''

''کیا ہے مقصد؟'' میں نے پوچھا۔

''کمپنی دُنیا کی گندگی دھونا چاہتی تھی تاکہ عوامی صحت میں کچھ تو نکھار ہو۔''

''اچھا ہے مقصد'' میں نے کہا۔ ''لیکن کیا دنیا کی گندگی کو صاف کرنے کے لیے تمہارے پاس بھرپور ڈٹرجنٹ اور مین پاور ہے؟''

پھر لڑکی کے جواب دینے سے پہلے ہی کہا ''میں پھر کہتا ہوں کہ گندے کپڑوں سے زیادہ گناہوں کے داغ میرے کردار کی چادر پر لگے ہیں...... پر چھوڑیے یہ باتیں۔''

میں نے لڑکی سے کہا ''آج کی تاریخ بڑی اہم ہے اور میں اپنے دوست کا انتظار کر رہا ہوں۔ آج کے دن وہ جہاں کہیں بھی ہوتا ہے یعنی دنیا کے کسی بھی کونے میں فرانس، جرمنی، لندن، کراچی، اسلام آباد، کوئٹہ کہیں بھی ہو وہ آج کے

دن آتا ہے اور ہم خوب انجوائے کرتے ہیں۔''

''وہ دلچسپ آدمی ہے۔'' لڑکی نے کہا۔

''دلچسپ اور پراسرار'' میں نے کہا۔

''مجھے اپنے دوست کے بارے میں اور بھی کچھ بتایئے۔''

''تمہارا اشتیاق بڑھتا جا رہا ہے تو سنو۔ اس کی قمیص پر شکنیں ہی شکنیں ہیں۔ جب بھی کوئی لڑکی اس سے ملتی ہے اس کی زندگی میں ایک نئی شکن ڈال دیتی ہے۔ وہ ایک ایسے شکارے کی طرح ہے جس کے بادبان میں نے کئی لڑکیوں کی آنکھوں میں کھلے دیکھے ہیں۔ مگر پانی کی لہریں جنہیں تم کہیں کہہ سکتی ہوا سے دھکیل کر لڑکیوں سے دور لے جاتی ہیں۔''

ایک خاموشی کا ٹکڑا ڈولتا رہتا ہے اور پھر ڈیزالو ہو جاتا ہے۔

میں کہتا ہوں ''مجھے معلوم تھا کہ تم آؤ گی تو ہم دونوں مل کر اسکی شکنوں سے بھری زندگی سے کم از کم ایک شکن تو کم کر سکیں گے۔''

''کیا آپ کو یقین تھا کہ میں آنے والی ہوں؟''

''بالکل یقین تھا۔ پروگرام پورا طے ہے۔ کیا تمہیں معلوم نہیں۔''

لڑکی نے ایش ٹرے کی طرف دیکھا۔

''آپ سگریٹ پوری کیوں نہیں پیتے؟ آدھی پی کر بجھا دیتے ہیں۔''

میں مسکرایا ''آدھی سگریٹ بجھانے کی عادت مجھے اس وقت پڑی تھی جب ایک لڑکی نے کہا تھا تم یہیں انتظار کرو میں ابھی آئی۔ میں نے پوچھا تھا کتنی دیر میں آؤ گی؟ لڑکی نے میرے ہاتھ میں ابھی ابھی سلگائی سگریٹ کی طرف دیکھ کر کہا تھا۔ جب تک تم آدھی سگریٹ پیو گے میں آ جاؤں گی۔ میں نے آدھی سگریٹ پی کر بجھا دی تا کہ وہ واپس آ جائے لیکن وہ نہیں آئی۔ تب سے میں آدھی سگریٹ پی کر بجھا دیتا ہوں۔''

میں نے کہا'' میں نے ایک بار اس کو دیکھا۔ وہ بے تحاشہ رو رہا تھا۔ میں نے سبب پوچھا تو اس نے کہا تھا کہ جب میں کسی سے ملتا ہوں تو میری انا زخمی ہو جاتی ہے۔ کبھی کبھی تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ میں کسی سے ملنے سے پہلے ہی بچھڑ جاتا ہوں اور رو رو کر اپنی انا کو مناتا ہوں۔''

لڑکی بغور میری باتیں سن رہی تھی۔ تبھی ایک کوا آ کر اٹاری پر بیٹھ جاتا ہے اور اپنا سر بائیں نیوڑھا کر دیکھتا ہے اور کائیں کائیں کرنے لگتا ہے۔

''یہاں کوے کا کیا کام؟' یہ کیوں آیا ہے۔'' لڑکی پوچھتی ہے۔

''یہ کوا بلا وجہ نہیں آیا۔ کوا لاش کو دفن کرنے کا طریقہ بتانے آیا ہے۔''

''کیا تمہارا دوست دفن کرنے کا طریقہ نہیں جانتا؟''

''نہیں''

''وہ کیسے دفن کرے گا؟''

''مجھے!'' یہ ایک طویل تاریخ اور پرانی روایت ہے اور کوے کا اپنا رول ہے۔

ذرا رُک کر میں لڑکی سے پوچھتا ہوں۔

''تمہارا نام سعدیہ ہے نا؟''

''ہاں......''

''دیکھو سارا کام پروگرام کے مطابق ہو رہا ہے۔ اپنے وقت پر تم بھی آ گئیں۔ اپنے وقت پر کوا بھی آ گیا۔''

''مگر تمہارا دوست کب آئے گا۔'' لڑکی پوچھتی ہے۔

''وہ بس آتا ہی ہوگا۔'' میں نے جواب دیا۔

''میں اُٹھا اور شمال کی طرف گیا وہاں کی بند کھڑکی کھول دی جیسے ہی کھڑکی کھلی باہر سے سمندر کے چنگھاڑنے کی آواز آئی۔ لڑکی ڈر گئی۔ کھڑکی سے باہر مہیب اندھیرا۔ صدیوں پرانا چمکدار نرم اندھیرا اور اتنی ہی پرانی سمندر کی چنگھاڑ۔

میں نے کہا ''سمندر کے تیور کتنے بھیانک ہو رہے ہیں۔ بس ایسے ہی میں وہ ہے۔

رات بھیگ رہی تھی اور چاند گواہ تھا۔ میں نے لڑکی کو پا کر اپنی بائیں پسلی کے میٹھے درد میں افاقہ محسوس کیا تھا۔ چاند گواہ تھا کہ لڑکی کو مارکس کے روٹی کے فلسفے سے زیادہ فرائیڈ کا جنسی فلسفہ زیادہ راس آیا تھا۔ کیونکہ مرد کو روٹی پیدا کرنی تھی۔

''کب آئے گا تمہارا دوست؟'' لڑکی کھڑکی کے قریب کھڑے رہ کر بے چینی ظاہر کرتی ہے۔

''بس وہ اب کسی بھی وقت آ سکتا ہے۔ میرے خیال میں تم اسے ضرور جانتی ہوں گی۔ اکثر لڑکیاں اُسے جانتی ہیں۔''

''نہیں میں اسے نہیں جانتی''

میں نے سگریٹ کا گہرا کش لیا۔

''اکثر لڑکیاں یہی کہتی ہیں۔ کئی بار تو لڑکیاں اسے پہچاننے سے انکار کر دیتی ہیں۔''

''نہیں میں اُسے بالکل نہیں جانتی۔''

''میں نے اُس سے کہا تھا تمہارے بارے میں کہ تم آنے والی ہو۔مگر وہ بھی یہی کہتا ہے کہ وہ تمہیں نہیں جانتا لیکن میں جانتا ہوں کہ وہ جھوٹ بولتا ہے۔''

کئی بار چاند نکلتا اور غروب ہوتا ہے۔

میں کہتا ہوں ''اس کے پاؤں میں ایک چکر ہے۔ وہ کہیں ایک جگہ نہیں ٹکتا۔ بس گھومتا رہتا ہے۔ایک جگہ رہنے پر وہ گھٹن محسوس کرتا ہے اور اُس کی بے چینی بڑھ جاتی ہے۔ مجھے کبھی کسی سے محبت نہیں ہوئی۔ آئندہ ہوگی یا نہیں۔ کچھ کہا نہیں جا سکتا۔مگر وہ جو میرا دوست ہے بہت محبت کرنے والا آدمی ہے۔کبھی کبھی میں اُس سے کہتا ہوں کہ تم گاؤں کی اس عورت کی طرح ہو جو برسوں سے دل کی ہنڈیا میں دہی بلو رہی ہے مگر مکھن نہیں نکلتا۔ میری بات سن کر وہ ہنستا ہے اور اس کی ہنسی سے کچے دودھ کی مہک آتی ہے۔

''کیا اس کے دودھ کے دانت گرے نہیں ہیں؟''

''نہیں...... ارے اسے تو ابھی عقل داڑھ بھی نہیں نکلی ہے لیکن وہ بالغوں سے بھی زیادہ بالغ ہے۔وہ اتنا جنونی ہے کہ اگر کوئی لڑکی اسے پسند آ جائے تو اپنے رقیب کو قتل بھی کر سکتا ہے۔''

وہ آ گیا۔ وہ آ گیا۔ میں چلاتا ہوں۔ سمندر کی چنگھاڑ کمرے میں بھر گئی ہے۔ دونوں لہروں میں ڈوب رہے ہیں۔وہ آ گیا ہے۔

آ ؤ اور مجھے قتل کر دو اور سعدیہ کو لے کر دور نکل جاؤ۔ میں اُداسی بھرے لہجے میں کہتا ہوں۔

دور کہاں نکل جاؤں بتاؤ۔ میری پرواز محدود، کہاں نکل جاؤں۔تم نے تو دنیا کو گلوبل ولیج بنا دیا ہے۔

کیا تمہیں سعدیہ نہیں چاہیے۔

وہ اٹاری پر بیٹھے کوے کو اُڑاتا ہے۔ میں نے اپنا رول بدل دیا ہے۔

نہیں پروگرام کے مطابق سب کچھ ہوگا۔ تاریخ ضرور اپنے آپ کو دہرائے گی۔

یہ کیا ضروری ہے۔ میرا دوست بڑی بھیانک ہنسی ہنس رہا ہے۔ایک پر اسرار قہقہہ لگا رہا ہے۔ہم تینوں کمرے میں ٹیبل کے پاس پاس بیٹھے ہیں۔میرا دوست کہتا ہے۔

''یہ دنیا تپ رہی ہے۔ پانی بھاپ بن کر بڑی تیزی سے اُڑ رہا ہے۔لوگ بھوکے ننگے مر رہے ہیں۔شیر پوچھ رہا ہے۔جنگل کٹ گئے اب ہم کہاں جائیں؟ پرندوں کے چہچہے ختم ہوتے جا رہے ہیں۔ آلودگی کے آسمان ڈھکنے سے ہم تاروں سے دور ہو گئے ہیں۔ذرا ٹائم مشین میں بیٹھ کر آگے مستقبل میں جاؤ۔دنیا کتنی بھیانک اور بدہیبت ہوگئی ہے۔دیکھو گے تو ڈر جاؤ گے۔ایسے میں اب میں کسی غار میں سونا چاہتا ہوں۔تاکہ اس جنجال سے چھٹکارہ پاؤں اور جاگوں تو ایک نئی دُنیا دیکھوں۔

اپنے دوست کی بات سن کر اُداس ہوگیا اور کہا۔

یہ تو آج کی بات ہے میرے دوست۔ ہمارے حالات کب پریشان کن نہیں رہے۔آج بھی کہیں سے کچھ نہیں بدلا ہے۔پتہ ہے ہم صدیوں بعد جاگے ہیں۔اُٹھو اور نان بھائی کی دکان پر جا کر اپنے کھوٹے سکے چلانے کی کوشش کرو۔

وہ آئے گا

مرے خوابوں کا شہزادہ
ابھی مجھ تک نہیں پہنچا
میں کب سے ایک
جن کی قید میں ہوں
میری آنکھیں اُس کا
رستہ تکتی رہتی ہیں
میں جب مایوس ہوتی ہوں
وہ دھیرے سے یہ کہتی ہیں
کبھی مایوس مت ہونا
وہ آئے گا
کسی دن تم کو
ساتھ اپنے لے جائے گا
وہ آئے گا

(ارسہ مون/ شاہ کوٹ)

فلک پہ اِک ستارا تھے مرے ابو
مرا واحد سہارا تھے مرے ابو

وہ زندہ تھے، نہیں تھا ڈوبنے کا ڈر
کہ کشتی اور کنارا تھے مرے ابو

سحر کی آس باقی ہو تو کیونکر ہو
کہ اُس کا تو اشارہ تھے مرے ابو

میں تمثیلہ چلوں گی اُن کے رستے پر
کہ حق کا اِک منارا تھے مرے ابو

(تمثیلہ لطیف)

کہانی کار

نیازت علی نیاز

میں کوئی پختہ کہانی کار تو نہیں بس یونہی جی میں آئی تو دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے کاغذوں کا پیٹ بھرنا شروع کر دیا۔ کچھ ادیب لوگوں سے شناسائی تھی انہیں یہ کاغذ دکھائے جنہوں نے اپنی معلوم تکنیک کے مطابق ان کی قطع برید کی، کچھ کانٹ چھانٹ خود کی تو دو چار کہانیاں نکل آئیں۔ دوستوں کو سنائیں، تعلقات استعمال کیے تو ایک دو جگہ چھپ گئیں۔ یوں میں کہانی کار بن گیا۔

اب یہی گنی چنی کہانیاں کہاں تک سنائی جائیں۔ سننے والوں کے کان پک گئے۔ پہلے تو دبے لفظوں میں پھر برملا کہنے لگے کچھ نیا لکھو۔

اپنی حالت یہ کہ خیالات منتشر، ذہن خالی، الفاظ سب رُوٹھے ہوئے، کوئی تال میل ہی نہیں بنتا۔ دل اگر مائل ہو تو خیالات اور الفاظ ساتھ چھوڑ جاتے ہیں لیکن لکھنا بھی ضروری ہے۔ ایک بھرم ہے جسے قائم رکھنا ہے۔ تو کیا لکھا جائے کہانی ہی نہیں ملتی۔ سو آج کل اسی ادھیڑ بن میں ہوں۔ اُٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے کہانی کی تلاش رہتی ہے۔ کسی اچھوتی سی کہانی کی۔

یہ روزمرہ بھی تو ایک بڑا مسئلہ ہے۔ اپنی تو ساری زندگی روٹی سے شروع ہو کر روٹی پر ختم ہو جاتی ہے۔ چار کمروں پر مشتمل گھر، سارے چھڑے مزدور بے چارے، سب کی بیوی بچے پیچھے گاؤں میں، صبح سویرے اُٹھو غسل خانے کے سامنے باادب کھڑے ہو جاؤ۔ جلدی نمبر لینے کی کوشش کرو، کوئی دوسرا چلا گیا تو دیر ہو جائے گی۔ سات بجے گاڑی لینے آتی ہے۔ نکل گئی تو پبلک ٹرانسپورٹ پر جانا عذاب، شہر سے باہر ادارہ، پیدل سفر، ویگنوں کے دھکے اوران کی من مانیاں۔ ان کا دل کرے تو چل پڑیں نہیں تو مجال ہے کہ آپ کسی گاڑی والے کو جب وہ سٹاپ پر کھڑا سواریوں کی تلاش میں ہو، چلنے کا کہہ دیں۔ وہ کچھ سننے کو ملے گا کہ اللہ توبہ۔ اُوپر سے کرایوں میں آئے دن اضافوں نے جان کھینچ لی ہے۔ سو دیر ہوئی تو بڑی مشکلیں ساتھ دفتر میں بے شمار لوگوں کے کوسنے سنو اور وضاحتیں دیتے رہو۔ اس لیے ہر ممکنہ کوشش کہ صبح جلد اُٹھا جائے اور جلد از جلد غسل خانے میں داخل ہونے کا معرکہ سر کر لیا جائے۔ اس عمل میں صبح صبح لڑائی ہو سکتی ہے مگر کوئی بات نہیں۔ یہاں لڑ پڑو، بے نمبری کرو، اصول توڑ دو لیکن نہانے دھونے کے عمل کو جلد پایہ تکمیل تک پہنچا دو۔ اس کے بعد ناشتہ، شکر ہے ایک عدد بزرگ ساتھ ہیں جو کہ میرے ایک دوست کے بزرگ ہیں سو میرے بھی ہیں۔ غنیمت ہے یہ صبح سویرے اُٹھ کر نماز پڑھتے ہیں اور پھر ہمارے لیے چائے اور فی کس ایک عدد روٹی پکا دیتے ہیں۔ ناشتے کے ساتھ ساتھ لیکچر جاری رہتا ہے۔ تمہارا حال کچھ نہیں، اگر میں نہ ہوتا تو تم لوگ بغیر ناشتے کے جایا کرتے۔ صبح اُٹھ نہیں سکتے، تم لوگوں کو صفائی کا کچھ پتہ نہیں۔ برتن صحیح نہیں دھوتے، بے ترتیب پڑے ہوئے ہیں، کچن گندا ہوتا ہے، تم اپنے بستر سلیقے سے نہیں رکھتے وغیرہ وغیرہ۔ جلدی جلدی گرم پانی سے روٹی حلق میں اُتار کر کپڑے بدلو۔ کمرے کی دیواروں پر چپکی لکڑیوں میں ٹھکی کیلوں کے ساتھ لٹکے ٹلکے جو رات سونے سے قبل استری کر کے لٹکا دیے ہوتے ہیں۔ پہن کر بوٹ کسو اور پھر کمر کس لو۔ اگرچہ ان ٹلکوں میں میں اپنے آپ کو برہنہ محسوس کرتا ہوں مگر کیا کیا جائے مجبوری ہے جاب کی ڈیمانڈ ہے کہ پتلون ہر صورت میں پہنی جائے۔ اس میں بندہ سمارٹ، پڑھا لکھا اور بابو بابو لگتا ہے۔ شلوار قمیص ان پڑھ اور نچلے طبقے کے گنوار مزدوروں کا لباس ہے۔ اس میں آپ کی شخصیت دب جاتی ہے۔ یہ میرا نہیں میرے ساتھیوں کا خیال ہے۔ میں سمجھتا ہوں شخصیتیں لباس کی نہیں لباس شخصیتوں کے محتاج ہوتے ہیں۔ اچھا لباس وہی ہے جسے پہن کر آپ خود کو بہتر محسوس کریں۔ خواہ شلوار قمیص میں خواہ پینٹ شرٹ میں مگر کیا کیا جائے ہمارے خودساختہ اصولوں اور رواجوں کی جکڑ بندی کا۔ ارے بھائی زندگی پہلے ہی کیا کم جبر کا شکار ہے اس پر آپ خود بھی گھیرا تنگ کیے جا رہے ہیں۔ یہاں تک کہ دم گھٹنے لگے مگر مجبوری ہے۔ ہونہہ مجبوری مجبوری...... ہمارا تو ہر

عمل ہی مجبوریوں کے تابع ہو کر رہ گیا ہے۔ بلکہ پوری زندگی ہی مجبوریوں کے تابع ہے۔ وقت پر سونا، وقت پر اُٹھنا، وقت پر کھانا، وقت پہ نکلنا، خودکار مشینوں کی طرح۔ بیوی بچے کوسوں دور مجبوری، میں تو کہتا ہوں یہ جو سانس چل رہی ہے یہ بھی مجبوری ہے اور سانس کھینچنا بھی کہ موت کا ایک دن معین ہے۔

کام پر پہنچو تو چار بجاؤ یا چار بجے تک بجتے چلے جاؤ۔ یہ ایک الگ طرح کی سرتال ہے۔ چار بجے گھر لوٹو تو رات کے کھانے کی تیاری شروع کر دو۔ سبزی کاٹو، پیاز چھیلو ہانڈی تیار کرو۔ کئی بار دل کرتا ہے کہ کمر سیدھی کر لیں مگر مجبوری ہے۔ یہیں پر بس نہیں آٹا گوندھوں۔ یہ نئی مصیبت ہے۔ اچھی خاصی ہوٹل سے پکی پکائی روٹیاں لے آتے تھے اور ویسے بھی روٹی دو روپے کی ہو گئی ہے اور اس دو روپے کی روٹی پر حکومت کے لیے ہر طرف سے داد وتحسین کے ڈونگرے برس رہے ہیں۔ یہ تو ہماری سیاست کا حال ہے۔ دُنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہمارے ہاں آج بھی روٹی پر سیاست ہوتی ہے، چمکتی ہے۔ ہمارے سرپرست بزرگ اس دو روپے کی روٹی سے بھی مطمئن نہیں ان کی جمع تفریق میں اپنا آٹا لے کر اپنی پکائی روٹی سستی پڑتی ہے۔ سو مجبوراً یہ نیک عمل بھی شروع ہو گیا۔ کرتے کرتے رات ہوئی کھانا کھایا، زمین پر پڑی چٹائیوں پر بستر بچھا کر لیٹے تو آرام ملا تو ٹانگیں پھر بھی سیدھی نہیں کر پائے کہ ٹی وی پر حالات حاضرہ جاننے والوں کا شوق آلتی پالتی مارے بیٹھا تنگ کمرے کو تنگ کرتا ہے اور مروت چپ رہتی ہے۔ رات گئے تک یہ تماشہ بھی چلتا ہے تو چلنے دیں اور صبح پھر............

اس صورت حال میں کہانی کیسے لکھی جائے۔ دوسری طرف دوستوں کا اصرار ہے کہ بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اب اگر اپنا روزمرہ بیان کرنے بیٹھیں تو ناک بھوں چڑھا اس سطحی سے روزمرہ کی سطحی گفتگو پہ فتویٰ صادر کر دیں گے۔ ایسا نہ ہو یہ فتویٰ ہمیں ادیبوں کے قبیلے سے نکال کر عام سطحی لوگوں میں لا کھڑا کرے۔ سو کہانی لکھنی ہے اور کہانی بھی کہانی ہونی چاہیے۔ خیال اچھوتا فکر انگیز ہو سکے تو فلسفیانہ اور فلسفہ بھی ایسا جو جلدی جلدی سمجھ نہ آئے۔ تکنیک کا بھی دھیان رکھنا ہے۔ غلطی کی گنجائش نہیں بڑی تنقید ہوتی ہے۔ تنقید نگار ایسی ایسی غلطیاں ڈھونڈ نکالتے ہیں کہ سننے والا دنگ رہ جائے۔ خیال کو توڑ مروڑ کر ایسی ایسی شکلیں بنا دیتے ہیں کہ یا تو آپ خوفزدہ ہو جائیں یا بے اختیار ہنسنے لگیں اور جب تنقید نگاری کا مقصد صرف اور صرف فن پارے کے نقائص کو سامنے لا کر فنکار کی تذلیل ہو تو پھر شیطان بھی پناہ مانگے اور اس بار مجھے چھری پانی میں نظر آ رہی ہے۔ وہ ادیب دوست جنھوں نے حوصلہ افزائی کی خاطر پچھلی بار میری کہانیوں کو سراہا تھا اب کی دفعہ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ چڑنے لگے ہیں اور موقع کی تاک میں ہیں اور وہ جنھوں نے اصلاح کی تھی وہ بھی اب نرم پڑتے دکھائی دیتے ہیں۔ اب اوّل تو انھوں نے اصلاح کرنی ہی نہیں اور اگر کی تو سارا پلاٹ ہی ملیا میٹ کر کے رکھ دیں گے اور شہکار کہانی منٹوں میں گھٹیا سطح پر آ جائے گی۔ میں بھی بڑا چالاک ہوں میں نے بھی سوچ رکھا ہے اگر قسمت نے مجھے ان لوگوں کے درمیان لا کھڑا کیا ہے تو میں بھی انہیں موقع فراہم نہیں کروں گا۔ بہرحال یہ ساری باتیں تو برسبیل تذکرہ کہہ دیں۔

ایک اچھا خاصا آئیڈیا آیا تھا۔ ایک دوست نے کہا کہانی میں بے جان چیزوں سے معنی خیز باتیں کرواؤ۔ مثلاً دیواروں سے، کمرے میں پڑی چیزوں سے، کرسی میز، تپائی، چارپائی، ان کی گفتگو کراؤ، پھر انہیں آپس میں لڑوا دو۔ سو میں نے اس آئیڈیے پر کافی سوچا کئی خوبصورت جملے ذہن میں آئے۔ دیوار اور دیوار پر ٹنگے کپڑوں کی آپس میں گفتگو تھی لیکن مسئلہ پھر وہی لکھنے کے لیے ٹائم نہیں۔ ایک دن موقع ملا کمرہ خالی پا کر لکھنا شروع کیا تو ایک صاحب نے آ کر ٹیلیویژن چالو کر دیا۔ ٹی وی پر خبر چل رہی تھی۔ سات سالہ بچی کا بائیس سالہ نوجوان سے نکاح موقع پر لوگوں کا ہجوم پولیس کا مقدمہ درج کرنے میں لیت ولعل کا قصہ، لڑکی کا ماں کا بیان۔ بچی کو تیس ہزار کے عوض رشتہ داروں نے بیچا ہے۔ مجھے بھی پینتیس ہزار میں خرید کر لائے تھے ابھی تک اپنے خریدار سے نباہ کر رہی ہوں۔ ذہن بھک سے اُڑ گیا، سارا موڈ چوپٹ کر دیا۔ اتنی مشکل سے کہانی کا سرا پکڑا تھا ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ ایسا پہلی بار نہیں ہوا۔ جب بھی کوئی آؤٹ سٹینڈنگ قسم کا آئیڈیا ذہن میں آتا ہے کوئی نہ کوئی مخل ہو جاتا ہے۔ اُوپر سے حالات حاضرہ نے جینا محال کر دیا ہے۔ ونی کا کیس ہے تو کبھی بچے برائے فروخت۔ سالے ہر جگہ پہنچ جاتے ہیں براہ راست گھروں میں گھس کر رپورٹنگ کرتے

ہیں۔ یرقان زدہ نیلے پیلے بچے، چولہا پھونکتی عورتیں، نحیف و لاغر بیمار سرپرستوں کے عجیب و غریب کنبے۔ ناانصافی، غربت، جہالت، مفاد پرستی، جرائم، طرح طرح کی کہانیاں۔ روز ایک نئی کہانی لے کر بیٹھ جاتے ہیں۔ انہیں دیکھ دیکھ کر طبیعت مکدر ہو جاتی ہے۔ بند کرو بھائی ہمیں ان سے کیا لینا، فلمیں دیکھو۔ دوسرے تفریحی چینل دیکھو مگر وہاں بھی وہی حال ہے۔ کہیں کتوں کی لڑائی میں ڈھول بجاتے ناچتے ہوئے حیوانِ ناطق نظر آ رہے ہوتے ہیں تو کہیں پہلوانوں کی اٹھا پٹخ اور مار دھاڑ سے لطف اندوز ہوتے تالیاں بجاتے مجمعے، کہیں فلموں میں رونے دھونے کے سین تو کہیں محبت کے سین۔ ہیرو، ہیروئن، عاشق، معشوق، ہجر فراق، سماج، ظلم و جبر، رونا، لڑنا، ملنا اور خوش ہو جانا۔ سالے فلم والوں کے پاس بھی یہی کچھ بچا ہے۔ کوئی بڑا آئیڈیا ملتا ہی نہیں ہے کسی کو۔ وہی فارمولا اسی فارمولے کی محبت۔ اس محبت والے موضوع نے لوگوں کو بالکل پاگل کر رکھا ہے۔ سیدھی سی بات ہے۔ فطری جبلت کا تقاضہ ہے مخالف جنس۔ ویسے ہی جیسے کھانا کھانا، بھوک تو بھوک ہی ہوتی ہے۔ ایک الگ طرح کی اپنے مزاج کی۔ مرد کا عورت سے عورت کا مرد سے وہی تعلق ہے جو انسان کا روٹی سے۔ اب آپ اس تقاضے کو جو بھی نام دے دیں۔ ہاں یہ ہے ساری زندگی کا محور بھوک ہے۔ روٹی، عورت، عورت روٹی۔ یہیں سے سارے قصے شروع ہوتے ہیں۔ بچے، کنبہ، جبر، غلامی، مزدوری، دیس بدری، استحصال، کرپشن۔ زندگی کے ساتھ لپٹی ذلتوں کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے جو بھوک سے نکلتا ہے تو کہیں رُکتا نظر نہیں آتا۔ یہ جو لیلیٰ مجنوں، ہیر رانجھا کے قصوں نے ہماری نسلوں پر بداثرات مرتب کیے ہیں اگر ان کی شادیاں کر دی ہوتیں تو اتنا کچھ نہ ہوتا۔ ساری ہیکڑی بھول جاتے۔ بیوی بچے اور ان کی روزمرہ ضروریات کو پورا کرنے کی مشقت ساری محبت خاک کر کے رکھ دیتی۔ فرہاد کے لیے بھی یہی سزا کافی تھی۔ پہاڑ تو کٹ گیا۔ اسے کاٹا جا سکتا ہے۔ تیشے سے ہی سہی۔ مزدوری کر کے دن کاٹے تو مانیں۔

تو کہانی کا ذکر کر رہا تھا۔ سوچا چھٹی والے دن لکھتے ہیں۔ ہفتے میں دو دن چھٹی ہوتی ہے مگر مہینے میں دو بار تو گھر جانا پڑتا ہے۔ کبھی بچے یاد آتے ہیں تو کبھی جنسی بھوک۔ کبھی کوئی ایمرجنسی اب بارہ گھنٹے کا سفر کر کے گھر پہنچیں تو ہلنے کی بھی سکت نہیں رہتی۔ اس پر گھر میں جمع شدہ کام۔ کسی کی شادی تو کسی کا ماتم، کسی کی عیادت تو کبھی مہمانداری۔ کچھ سمجھ نہیں آتا، کیا کریں۔ اُوپر سے وقت کی کمی۔ رات بھر کا سفر، دن کا کچھ حصہ سو جاؤ پھر گھر میں جمع شدہ کاموں کی فہرست مختصر کرو۔ سوتے جاگتے رات گزارو۔ دن کاٹو پھر رات بھر سفر کرتے ہوئے اگلی صبح سیدھے آفس پہنچو۔ کھلتی بند ہوتی آنکھوں سے دن گزارو پھر شام اور پھر وہی روٹی، کھانا سونا۔

پچھلے ہفتے چھٹی تھی۔ موقع دیکھ کر لکھنے بیٹھا تو بزرگوں نے چیزوں کی اٹھا پٹخ شروع کر دی۔ چٹائی اُٹھاؤ، فرش دھوؤ، جھاڑو دو، بستر ٹھیک کرو، چیزوں کو ترتیب سے رکھو۔ کئی بار کہا چیزیں جہاں پڑی ہیں پڑی رہنے دیں آپ کا کیا جاتا ہے۔ ہمیں تو اسی میں ترتیب نظر آتی ہے لیکن انہیں ہماری ترتیب سے وحشت ہوتی ہے اور ساتھ ہی فارغ بیٹھے بندوں کو دیکھ کر چڑ بھی۔ کئی بار سوچا الگ کمرہ لے کر اکیلے رہا جائے مگر کیا کریں وہاں بھی مجبوری آڑے آتی ہے۔ کراچی بل اکیلے ادا کرو، اُوپر سے کھانے وغیرہ کا الگ مسئلہ۔ اس کے علاوہ ایک مسئلہ اور بھی ہے، کچھ عرصہ ہمت کر کے اکیلے بھی رہا مگر یہ عمل بھی اذیت ناک ثابت ہوا۔ تنہائی کی وحشت اور پھر تنہائی میں بھٹکتی اذیت ناک ذہنی رو بہت تنگ کرتی تھی۔ یہ بھی کوئی بات نہیں کیوں کہ میں اذیتیں سہنے کا عادی ہوں اور ویسے بھی میرے ایک دوست کے بقول تنہائی اور خامشی سے سچائی کا عرفان ہوتا ہے۔ مسئلہ یہ درپیش ہوا کہ مجھے خون کے دباؤ میں کمی کا عارضہ لاحق ہو گیا۔ ایک بار جو دباؤ میں کمی زیادہ ہوئی تو مجھے کچھ ہوش نہ رہا اور اسی بے ہوشی اور نیم بے ہوشی کی کیفیت میں چوبیس گھنٹے گزر گئے۔ بس تقدیر ساتھ دے گئی مجھے ہوش آیا تو خود کو گھسیٹتے ہوئے نمک اور پانی تک لے گیا اور پھر رفتہ رفتہ نارمل ہوتا چلا گیا۔ اس واقعے نے مجھے ڈرا دیا۔ آس پاس کے گھروں میں بال بچے دار لوگ رہتے تھے اور آپ تو جانتے ہیں اس طرح کی آبادی میں اکیلے رہنے والے لوگ چھوت ہوتے ہیں۔ اکثر لوگ ان سے ہاتھ ملانا بھی گوارا نہیں کرتے کجا یہ کہ ان کے دروازے پر جا کر حال احوال پوچھا جائے۔ علاوہ ازیں میں عام لوگوں سے میل جول رکھنے میں بھی زیادہ مہارت نہیں رکھتا۔ سو اس

واقعے نے مجھے اپنے دوست اور اس کے عزیزوں کے ساتھ رہنے پر مجبور کر دیا۔ پھر ان لوگوں سے مانوسیت انس میں بدل گئی اور اب یہ انسیت بھی کہیں اور جانے کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ یہ جھگھٹا اور ہجوم بھی مجبوری ہے۔

سوچا اگلے دن بھی گھر پر ہوں اگلے دن ہی لکھ لوں گا لیکن دوسرے دن دوسرے کمروں کے مکین ساتھ کھینچ لے گئے جی کرکٹ کھیلیں گے۔ اب بھلا میری عمر ہے کرکٹ کھیلنے کی۔ میں تو بچپن میں اس طرح کے واہیات کھیلوں میں نہیں پڑا مگر ان جوانوں کا جوش و خروش اور کھیلنے کی شدید خواہش دیکھ کر ان کا دل رکھنے کی خاطر چل پڑا۔ گلیوں سے نکل کر گراؤنڈ میں پہنچے۔

گراؤنڈ کیا تھا ایک مضافاتی ریلوے اسٹیشن کا پچھواڑہ۔ ذرا سی خالی جگہ تھی ایک تنگ سی سڑک جس کے دونوں طرف تھوڑی تھوڑی جگہ خالی ہے۔ دائیں طرف کی خالی جگہ پر اہل علاقہ اپنے گھروں کا کچرا شاپروں میں بھر بھر کے لا کر پھینک دیتے ہیں۔ اسی خودساختہ کچرا کونڈی کے سرے پر گندے پانی کا جوہڑ ہے۔ سیاہ کالا بدبودار پانی۔ بائیں طرف کی جگہ قدرے صاف ہے لیکن اس میں اینٹ، بجری اور ریت کی ڈھیریاں پڑی ہیں جنہیں ملحقہ آبادی کے مکینوں نے مکانات کی تعمیر و مرمت کی غرض سے یہاں جمع کر رکھا ہے۔ سڑک پر سریے کے تین سلاخیں، ویلڈنگ سے جوڑی گئی وکٹیں کھڑی کر دیں۔ یہی سڑک پچ کہلائی۔ کھیل شروع ہوا۔ ہر بال کے بعد مختصر سا وقفہ ہوتا جس میں سڑک پر سے گزرتی گاڑیوں کو جگہ دی جاتی پھر کھیل شروع ہو جاتا۔ کئی بار گیند گندے پانی کے جوہڑ میں گری جسے پتھر مار مار کر لہریں بناتے ہوئے لہروں کے ذریعے کنارے پر لایا گیا۔ گیند کو دیوار پر مار کر صاف کیا گیا اور کھیل پھر شروع کر دیا گیا۔ ایک دفع تو گیند ریلوے لائنوں میں چلی گئی جسے پکڑنے کے لیے بھاگنے والا پرجوش فیلڈر اردگرد سے بے نیاز آتی ریل کے سامنے سے گزر گیا۔ شکر خدا کوئی حادثہ نہیں ہوا۔ اسی درمیان میں کہیں سے بے شمار بچے گلی ڈنڈا کھیلنے کے لیے آ دھمکے۔ ننگے پاؤں، سوں سوں کرتی ناکوں والے۔ گلے میں کپڑوں کے نام پر جگہ جگہ سے پھٹی ہوئی میلی کچیلی دھجیاں لٹکی ہوئی، ہاتھ پاؤں اور منہ پر میل ایسی جیسے دیہاتوں میں کچی دیواروں پر اپلے تھپے ہوتے ہیں۔ حیرت کی بات یہ کہ سب بہت خوش، مسرور، مگن اور مطمئن نظر آ رہے تھے۔

کہانی پھر وہیں رہ گئی۔ وہ ساری باتیں ذہن سے اُتر گئیں۔ میں سوچنے لگا یہ سڑک اور یہ ریلوے لائنیں گفتگو نہیں کر سکتیں؟ اگر یہ بات کریں تو کیا بات کریں گی؟ کچھ باتیں ذہن میں آئیں تو اتنے میں شور اُٹھا۔ ریلوے اسٹیشن پر مسافر ٹرین رُکی تھی۔ اس میں سے کئی کہانیاں اُتر گئیں اور کئی کہانیاں جانے لگیں۔ مگر میں ان کہانیوں کو نہیں لکھ سکتا۔ یہ ڈائجسٹی کہانیاں ہیں اور ایک بڑے فنکار کا موضوع بڑے نظریات، فلسفہ، خدا اور تجرید ہیں۔ مجھے تجرید لکھنی ہے یا خدا پر لکھنا ہے۔ چلو یہاں پر وقت نہیں ملتا تو آفس جا کر لکھیں گے۔ سو اگلے دن کام پر پہنچے۔ یہ ایک میڈیکل کالج ہے اور کالج ایک ہاؤسنگ سوسائٹی کا پراجیکٹ ہے۔ شہر سے باہر ہائی وے کے کنارے دیہاتیوں سے اونے پونے داموں خرید کر سیکڑوں ایکڑ کا رقبہ باؤنڈری وال کے اندر بند کر دیا گیا اور شاید اس سوسائٹی میں فروخت کے لیے پیش کیے جانے والے پلاٹوں کی قیمت میں اضافے اور سوسائٹی کو اہم بنانے کے لیے میڈیکل کالج کا پراجیکٹ شروع کیا گیا ہے۔ یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ کسی بڑے مقصد کے تحت بنایا گیا ایک مشنری جذبے کے ساتھ واللہ اعلم۔ پیسہ تھا چھ ماہ کے اندر اندر سب کچھ مکمل۔ سو کی تعداد میں سٹوڈنٹ بھی آ گئے۔ ساڑھے چار لاکھ سالانہ فیس پر۔ ہمارا ڈیپارٹمنٹ اناٹومی ہے۔ ہمارے بلاک کی دوسری منزل پر ڈائی سیکشن ہال ہے۔ جب کہ تیسری منزل پر اناٹومی میوزیم اور ہسٹالوجی لیب۔ ہمارے ڈیپارٹمنٹ میں خاصے کی چیز ڈائی سیکشن ہال ہے جہاں لاشوں کی چیر پھاڑ اور حصے بخرے کر کے انسانی جسم پڑھایا جاتا ہے۔ پہلی بار داخل ہونے والے کی سانس رُک جائے۔ خوف، دہشت اُوپر سے حنوط کے لیے استعمال کیا جانے والا آنسو گیس کا مائع میں تبدیل شدہ محلول مسلسل آنکھوں میں چبھتا رہتا ہے۔ یہ لاوارث لاشیں ہیں۔ کچھ پتہ نہیں کون ہیں۔ کیا کرتے تھے۔ کہاں سے آئے۔ کسی کی کوئی کہانی نہیں اگر ہے تو اتنی سی کہ یہ سڑک کنارے مردہ پایا گیا۔ یہ ایکسیڈنٹ میں مرا وارث نہیں ملے۔ یہ بیمار ہسپتال میں دم توڑ گیا وارث کوئی نا ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر نشئی ہوتے ہیں۔ جو نہ جانے زندگی کے کس دکھ کا شکار ہو کر نشے کی لت میں پڑے لاوارث ہوئے۔

استعمال ہونے والے لاشے سڑک کنارے سردی کی شدت سے مردہ پائے گئے تھے۔ ان میں کئی ایسے تھے جنہیں شاید زندگی میں ہسپتال، علاج، دوائی اور ڈاکٹر کا منہ دیکھنا بھی نصیب نہ ہوا ہوگا۔ کئی دفع تو مزاروں کے مجاور فقیروں اور مزدوروں کی لاشیں بھی دیکھنے کو ملیں۔ انسانیت کی خدمت کے پیش نظر یہ عمل جائز کہلاتا ہے۔ بھلے وہ انسانیت صرف پیسے والے کے کام آنے والی ہو۔ خیر وہ بھی تو انسان ہیں اور دیکھا جائے تو انسان وہی ہے جس کے پاس پیسہ دولت، جاگیر، جائیداد اور عہدہ ہوتا ہے۔ اگر آپ نچلے طبقے کو بھی انسانوں میں شمار کرنے والے ہوں تو آپ کی سوچ پر صرف ہنسا ہی جا سکتا ہے۔

ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ نیا بندہ اس ماحول سے ڈر جاتا ہے لیکن یہاں کام کرنے والے بالکل نارمل لوگ ہوتے ہیں۔ ویسے بھی اسے کام سمجھ کر اگر آپ اس سارے عمل میں شریک ہوں تو خوف دکھ اور پشیمانی ختم ہو جاتی ہے۔ میں اس ماحول کا عادی ہوں مگر یہ میرا سیکشن نہیں۔ میں تیسری منزل پر میوزیم کی دیکھ بھال کرتا ہوں جہاں انسانی جسم کے تمام اعضاء کے ماڈل پیٹ کی زندگی اور بعد کے جسم کے ماڈل پلاسٹر آف پیرس کے بنے یہاں رکھے ہوئے ہیں۔ یہ مختلف ممالک سے منگوائے گئے ہیں۔ ساتھ ہی بون بینک ہے اصلی انسانی ہڈیاں جو لائبریری کی کتابوں کی طرح بچوں کو پڑھنے کے لیے دی جاتی ہیں بالکل لائبریری کے اصول پر۔ ان ہڈیوں کو قبرستان سے گورکن نے چرا کر درمیانی بندے پر اور درمیانی آدمی نے کالج والوں پر بیچا ہے۔ اس کاروبار کی الگ داستان ہے۔ سب کے ساتھ پیٹ لگا ہے اور یہ بھوک کی ذلتیں ہیں۔ یہاں ان ہڈیوں کو مختلف مراحل سے گزار کر پالش کر دیا جاتا ہے اور پھر ایشو کر دی جاتی ہیں۔ ویسے میں نے اس ڈیپارٹمنٹ کے تمام سیکشن میں کام کیا ہوا ہے۔ بلکہ میڈیکل کالج کے تمام ڈیپارٹمنٹس میں کام کیا ہوا ہے۔ یہ میرے تجربے میں آیا چھٹا میڈیکل کالج ہے۔ معاہدے کے تحت نوکری کرتا ہوں۔ جہاں چار پیسے زیادہ آفر آتی ہے وہیں چلا جاتا ہوں۔ پاکستان کے تقریباً تمام بڑے شہر گھوم لیے۔ لہٰذا میں اور میرے جیسے کئی دوسرے مزے سے کٹی پھٹی لاشوں کے پاس کھڑے ہو کر کھا پی لیتے ہیں۔ ساتھ دُنیا بھر کی باتیں کرتے ہیں۔ ہنستے، مسکراتے، قہقہے لگاتے۔ باہر کا بندہ دیکھے تو حیران رہ جائے۔

تو بھائی خوف یا دکھ کس بات کا۔ زندگی کا سب سے بڑا دکھ تو خود زندگی اور اس کا اختتام ہے۔ میں زندہ ہوں اور زندہ رہنے کے لیے یہ سب کرنا پڑتا ہے اور ہاں دکھ تو وہی ہے جسے آپ محسوس کریں اور ہم وہی محسوس کرتے ہیں جس سے گزرتے ہیں۔ میرے سارے دکھ میرے ہیں، خاص ذاتی۔ ذات سے ہٹ کر دکھوں کو محسوس کرنے والے شاید ہوں مگر میں انہیں نہیں جانتا۔ میرا تجربہ یہی ہے کسی دوسرے کی میت پر رونے والا کسی اپنے مرے کو یاد کر کے روتا ہے۔ سو میں خوش ہوں تو پھر تو کوئی مسئلہ نہیں ہے۔

بات ہو رہی تھی کہانی کی درمیان میں غیرضروری باتیں کرنے لگ جاتا ہوں۔ اب کے سوچا خدا پہ لکھوں۔ تجرید کے بعد ہماری آج کی کہانی کا یہ بھی ایک بڑا موضوع ہے۔ اس کی ذات، اس کی سوچیں، اس کی تخلیق، اس کی تخلیق کے اسرار اور نااسرار کے پیچھے چھپے رہنے کی کوشش۔ تو اس کائنات کے اسرار پر سوچا اور لکھا جائے۔ میں اپنے میوزیم میں آ بیٹھا۔ لکھنا شروع کیا تو میوزیم کے پچھلے حصے میں لکڑی سے پارٹیشن کر کے ڈاکٹروں کے کمرے بنانے والے آ گئے۔ لکڑیوں میں ٹھکتی کیلوں کی ٹھک ٹھک نے پریشان کر دیا تو جھنجھلا کر میوزیم سے باہر نکل آیا۔

میوزیم سے باہر نکلیں تو سامنے لیکچر ہال ہے۔ درمیانی خالی جگہ سے آگے کونے میں چار چھ سیڑھیاں چڑھ کر اُوپر کی طرف دائیں جانب واش رومز ہیں اور بائیں جانب ایک دروازہ لیکچر ہال کے اندر کھلتا ہے۔ یہ پچھلا دروازہ ہے۔ اسی طرح سامنے کی طرف بھی ایک دروازہ دوسری طرف کے واش رومز کے لیے کھلتا ہے۔ اس طرف بھی سیڑھیوں سے نیچے آئیں تو آگے ہسٹالوجی لیبارٹری میں داخل ہو جاتے ہیں۔ لیکچر ہال کا دروازہ اور لیب کا دروازہ ایک دوسرے کے مقابل ہیں۔ ایک طرف کے واش رومز لیڈیز اور دوسری طرف کے مردانہ ہیں۔ دونوں طرف کے واش رومز اور لیکچر ہال کے دروازوں کے درمیان خالی جگہ ہے اور اس خالی جگہ کی پچھلی دیوار شیشے کی ہے۔ یہ تیسری منزل ہے۔ یہاں کھڑے ہو کر آپ بالکل پہلو میں باؤنڈری لائن سے باہر چند گھروں پر مشتمل دیہات کی آبادی میں ہونے والی تمام نقل و حرکت کو دیکھ سکتے ہیں۔ بلکہ

ہمارے کالج کی بلڈنگ کے تمام پورشنز پر لگی کھڑکیوں کے شیشوں سے اس طرف کا نظارہ کر سکتے ہیں۔ یہ ایک چھوٹا سا دیہات ہے جس کے سادہ سے کچے پکے دو دو کمروں اور کھلے صحن کے ساتھ بنے گھر ہیں۔ ہماری بلڈنگ نے اس آبادی کے چادر اور چار دیواری کے تقدس کو بری طرح پامال کیا ہے۔ چار دیواری اور چھت ہونے کے باوجود یہ لوگ برلبِ سڑک کھلے آسمان تلے روزمرہ کے کاموں میں مشغول لوگوں کی طرح سے ہیں۔ مختلف زاویوں سے کھڑے ہو کر دیکھیں تو اپنے کمروں لیٹی عورتیں، گھروں کے صحن میں جھاڑ دیتی، برتن دھوتی، اُپلے تھاپتی، اردگرد سے بے نیاز عورتیں نظر آتی ہیں۔ اپنے کام سے فارغ سینٹری ورکرز اور جنرل ورکرز کے لیے یہ نظارے بہترین مشغلہ ہیں۔ انہی نظر بازیوں نے ترقی کرتے کرتے اشارہ بازی کی منزل کو بھی پا لیا ہے۔ جب تک کالج میں سٹوڈنٹ نہیں آئے تھے۔ یہ لوگ نظارہ تھے مگر جونہی پہلی کلاس آئی تو نظر ہو گئے۔ افتتاحی تقریب اور پھر سپورٹس ڈے۔ ایسے منظر تو انہوں نے کبھی خواب میں بھی نہ دیکھے ہوں گے۔ اپنے گھروں کی چھتوں پر شوق، محویت اور حیرت سے دانتوں میں اُنگلیاں دبائے رنگ برنگ چست جاموں میں ملبوس اُچھلتی دوڑتی ناچتی گاتی لڑکیاں اور ان کا ساتھ دیتے لڑکوں کو ان دیہاتی عورتوں نے شاید پہلی بار دیکھا تھا۔ نہ ادھر کا شوق کم تھا نہ ادھر کا جنوں اور پھر کچھ دنوں کے بعد کالج کی چھت پر کھڑے طالب علم جوڑے کو بوس و کنار کرتے ہوئے سارا گاؤں دیکھ رہا تھا۔ ہاں یہ فرق ہے انہیں دیکھنے کے لیے سب کو گردنیں اُٹھا کر نظریں اُوپر کر کے بلندی پر دیکھنا پڑ رہا تھا۔ جب کہ یہ لوگ نیچے تھے۔ انہیں یہ بات سمجھنے میں شاید کچھ وقت لگے گا کہ ہمارے معاشرے کی طبقاتی تقسیم نے قدروں کو بدل دیا ہے۔ سب کی اپنی قدریں ہیں، سب کا اپنا جائز ہے اور سب کا اپنا ناجائز۔ اُس طرف کی بدکرداری اس طرف کی روشن خیالی ہے۔ اُس اشارے کرتی گونگی لڑکی کو اُس طرف کے لوگ دیکھ لیں تو جانیں کیا کچھ کر گزریں مگر اس طرف اشارے بازی سے بہت آگے کی کئی منزلوں کو سر ہوتے دیکھنے والی آنکھ کوئی نہیں ہے۔ اپنی آنکھیں بند رکھو اور اگر کوئی آنکھ کسی منظر کو دیکھ کر نتائج اخذ کرنے کی کوشش کرے گی تو بصارت سے محروم کر دی جائے گی۔ کہنے کو اگر چہ ہم ایک قوم ہیں مگر ایک قوم نہیں ہیں۔ ہمارے معیار الگ، ہماری قدریں الگ ہمارا قانون الگ۔ اس طرف کا کوئی دیہاتی گھٹیا قسم کا ٹھرا یا الکوحل پی کر اپنے اندر کو برباد کرتا پکڑا جائے تو مہینوں ضمانت نہ ہو۔ اس طرف اعلیٰ درجے کی شراب، یورپین ممالک سے منگوائی گئی آسانی سے گھروں تک پہنچ جائے اور صبح شام کا مشروب ہو تو کوئی بڑی بات نہیں۔ اس طرف نگاہوں میں در آنے والی جنسی بھوک کی چمک بھی جرم تو اس طرف کھلم کھلا جنسی اختلاط بھی روزمرہ کا معمول اور بے عیب ٹھہرا۔

میں پھر بھٹک گیا۔ ذہنی رو ہے کہ بہتی چلی جاتی ہے کسی ایک نقطے پر ٹکے تو میں سوچوں اور کسی بڑے آئیڈیے کی بڑی کہانی لکھ پاؤں سر دست تو خود کو بے بس پاتا ہوں۔ میں واپس میوزیم میں آیا تو گھر سے فون آ گیا۔ بیوی برہم ہو رہی تھی اتنے دنوں سے فون کیوں نہیں کیا۔ تمہیں کیا ہمارے ساتھ جو کچھ بھی ہوتا رہے۔ تم تو مزے میں ہو۔ مجھے بچے تنگ کرتے ہیں چھوٹا ساری رات روتا ہے میری نیند پوری نہیں ہوتی۔ بلڈ پریشر لو ہے، سر چکرا رہا ہے۔ کمزوری بڑھ گئی ہے۔ تم ہوتے تو مجھے ڈاکٹر کے پاس لے جاتے مگر تمہیں ہمارے حال سے کیا غرض۔ تم اپنی دُنیا میں گم ہو۔ یہ لو وجاہت تم سے بات کرنا چاہتا ہے۔ ہیلو پاپا! آپ کدھر چلے جاتے ہیں۔ بیٹا روزی کی تلاش میں۔ آپ کب آئیں گے! بیٹا! اسی ہفتے انشاء اللہ۔ میرے لیے سائیکل ضرور لانا۔ آپ نے پہلے بھی کہا تھا مگر پچھلے ہفتے آپ نہیں آئے۔ آپ کیوں نہیں آئے تھے؟ بیٹا پچھلے ہفتے میں کہانی کی تلاش میں تھا۔ وہ کس لیے پاپا۔ ہم کہانی کا کیا کریں گے؟ ہاں بیٹا، بس ویسے ہی فضول کاموں میں پڑ گیا تھا۔ اب نہیں کروں گا۔ ہمیں کہانیوں سے کیا لینا دینا۔ میں اگلے ہفتے آؤں گا اور اپنے بچے کے لیے سائیکل لے کر آؤں گا۔ خدا حافظ

آپ کسی بڑے آئیڈیے کی نئی کہانی تلاش کرتے رہیں میرے پاس تو میرے اردگرد پھیلی یہی کہانیاں ہیں جو اگر چہ پرانی ہیں پر کبھی پرانی نہیں ہوتیں۔

❀❀❀

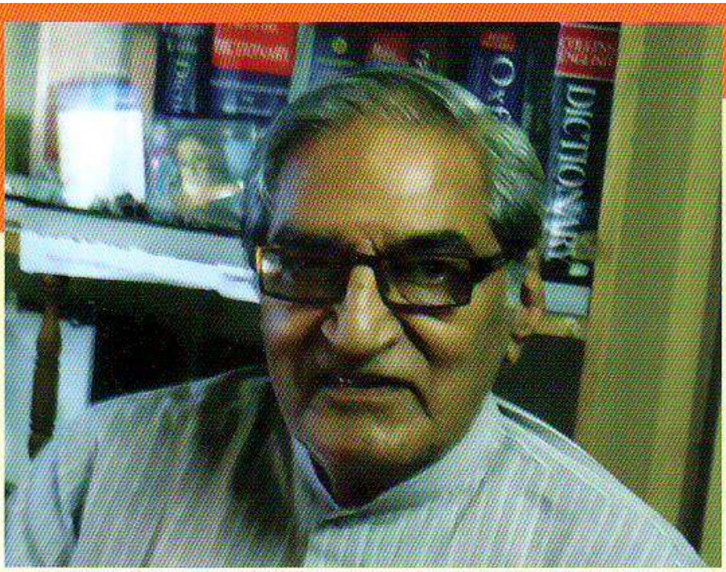

☒ ٹی وی ڈرامہ ابھی کمرشل بریک کے دور میں ہے۔

☒ موجودہ پاکستان قائداعظم، علامہ اقبال اور قائدعوام ذوالفقار علی بھٹو کا پاکستان نہیں ہے۔

☒ میرے والد نے بھگوت گیتا اور ماموں شریف کنجاہی نے قرآن مجید کا پنجابی ترجمہ کیا۔

نامور کالم نگار اور شاعر منو بھائی سے عامر بن علی کا انٹرویو

س: اپنی زندگی کے ابتدائی سفر کے متعلق کچھ بتائیں۔

منو بھائی: میری پیدائش ۶ فروری ۱۹۳۳ء کی ہے۔ یہ وہی دن ہے جب جرمنی میں ہٹلر کی چانسلر شپ ہوئی۔ میرا تعلق ایک لوئر مڈل کلاس سے ہے۔ میرے والد ریلوے میں ملازم تھے۔ اُس دور میں بے روزگاری کا دور دورہ تھا۔ تحریک آزادی ابھی باقاعدہ طور پر شروع نہیں ہوئی تھی لیکن لوگوں میں شعور بڑھ رہا تھا۔ میرے دادا امام مسجد تھے لیکن اُن کا پیشہ کتابوں کی جلد بندی تھا۔ امامت اُن کا پیشہ نہیں تھا۔ وہ پنجابی کے شاعر بھی تھے۔ اُن کا نام میاں غلام حیدر تھا۔ انہوں نے گیتا کا پنجابی ترجمہ بھی کیا تھا۔ وہ مہاراجہ کشمیر کے فارسی کے اتالیق بھی رہے۔ پنجابی کے ممتاز لکھاری شریف کنجاہی میرے ماموں تھے۔ انہی کی وجہ سے میرا ترقی پسندوں سے تعلق بنا جن میں احمد ندیم قاسمی بھی شامل ہیں جن کو میرے بارے میں علم تھا کہ گھر میں مجھے منو کہا جاتا ہے۔ انہوں نے میرا نام منو بھائی رکھا اور امروز میں میری نظم چھاپی۔

سو: بچپن کن شہروں میں گزرا اور اخبار میں کیسے لکھنا شروع کیا؟

جواب: میری پیدائش وزیر آباد کی ہے۔ اس کے بعد راولپنڈی اور پھر لاہور میں وقت گزرا۔ بچپن میں راولپنڈی سے ''تعمیر'' اخبار نکلتا تھا جس میں لکھنے کی ابتدا کی۔

س: ''سونا چاندی'' آپ کا ایک یادگار ٹی ڈرامہ ہے جس کے بعد اب ایک عرصہ سے آپ نے ٹی وی کے لیے ڈرامہ نہیں لکھا اس کی کوئی خاص وجہ؟

جواب: موجودہ دور میں ٹی وی پر کمرشل بریک آیا ہوا ہے جس میں ہمارا کوئی کام نہیں۔ اب یہ بریک ختم ہونے والا ہے۔ وہ ڈرامہ جو اشفاق احمد کے ساتھ قبر میں اُتر گیا تھا وہ دوبارہ شروع ہونے والا ہے۔ اب میں جیو کے لیے سونا چاندی اینڈ کمپنی کے نام سے دوبارہ ڈرامہ لکھ رہا ہوں جس میں گلیمر کی بجائے اصل کرداروں کو سامنے لاؤں گا جو معاشرے کی اصل تصویر ہیں۔

س: پنجابی کے علاوہ اور کس زبان میں شاعری کی؟

جواب: میں نے شاعری پنجابی زبان میں ہی کی ہے اور وہی میری پہچان بنی ہے اور اس شاعری پر مجھے ''پرائیڈ آف پرفارمنس'' ملا ہے۔ میرا پنجابی مجموعہ ''اجے قیامت نہیں آئی'' کے نام سے چھپ چکا ہے۔

بسمل صابری / ساہیوال

وہ عکس بن کے مری چشم تر میں رہتا ہے — عجیب شخص ہے پانی کے گھر میں رہتا ہے

مترنم آواز، خوب صورت، خوش شکل چہرہ، جدید لہجہ، جاندار اندازِ تکلم، کوئل سی سریلی آواز، شاعری میں خوب صورت الفاظ کا چناؤ، ممتاز ماہر تعلیم ان تمام خصوصیات کو یکجا کیا جائے تو وہ یقیناً بسمل صابری کا نام بنتا ہے۔ ان کا تعلق ساہیوال کی زرخیز دھرتی سے ہے۔ آپ 22 ستمبر 1937ء کو منٹگمری (حال ساہیوال) میں پیدا ہوئیں۔ ایم اے اُردو اور ایم اے زیکل ایجوکیشن تک تعلیم حاصل کی اور شعبہ درس و تدریس سے وابستہ ہوگئیں۔ آپ کو پہلا ایوارڈ 1960ء میں ملا جو وائی ایم سی اے ہال دی مال لاہور، جو بہترین کلام اور بہترین ترنم کا تھا اس کے مصنفین میں فیض احمد فیض، صوفی تبسم، احسان دانش، قتیل شفائی اور ایس ایم ظفر شامل تھے۔ 22 مارچ کو دوستانِ قلم قبیلہ گوجرانوالہ میں شیلڈ اور ایوارڈ ملا اور شاعری کی صدارت کی۔ جولائی 2012ء کو اُردو ادب میں قابل ستائش کارکردگی پر Y.G.H.S سوسائٹی کی طرف سے ایوارڈ رائل نیوز کے چیئرمین میاں وٹو صاحب سے ملا۔ 23 مارچ 2012ء کو Excellence ایوارڈ بہترین شاعرہ کا جناب محمد اشفاق قاضی کمشنر ساہیوال نے یومِ پاکستان کی تقریب میں ملا۔

نہ صبا کی دوستی ہے نہ فضا کی ہمدمی ہے
جہاں پھول کھل رہے تھے وہاں دُھول اب جمی ہے
ہوئے ہم قریب لیکن ہیں نصیب اپنے اپنے
ترے لب پہ مسکراہٹ مری آنکھ میں نمی ہے
تجھے پا لیا ہے میں نے مگر اب بھی سوچتی ہوں
میری زندگی میں شاید کسی چیز کی کمی ہے
وہ سرورِ اوّل اوّل یہ غرورِ آخر آخر
وہ کرم بھی تھا ضروری یہ ستم بھی لازمی ہے
مری چشم تر یہ بسمل نہ رکھو تم اپنا دامن
یہ گھٹا برسنے والی کہیں اس طرح تھمی ہے

وہ عکس بن کے مری چشم تر میں رہتا ہے
عجیب شخص ہے پانی کے گھر میں رہتا ہے
پیام بر ہے وہی تو مری شبِ غم کا
وہ اک ستارہ جو چشمِ سحر میں رہتا ہے
کھلی فضا کا پیامی، ہوا کا باسی ہے
کہاں وہ حلقۂ دیوار و در میں رہتا ہے
جو میرے ہونٹوں پہ آئے تو گنگناؤں اُسے
وہ شعر بن کے بیاضِ نظر میں رہتا ہے
گزرتا وقت مرا غم گسار کیا ہوا
یہ خود تعاقبِ شام و سحر میں رہتا ہے
مرا ہی رُوپ ہے تو غور سے اگر دیکھے
بگولہ سا جو تری رہ گزر میں رہتا ہے
نہ جانے کون ہے جس کی تلاش میں بسمل
ہر ایک سانس مرا اب سفر میں رہتا ہے

اس کو منظور ہے کیا پوچھ لیا کرتے ہیں
ہم تو قاتل کی رضا پوچھ لیا کرتے ہیں
چوٹ کھاتے ہیں مگر ساتھ ہی گھائل تیرے
لذتِ آہ و بکا پوچھ لیا کرتے ہیں
ہم وہ مجرم ہیں کہ ہر جرمِ وفا سے پہلے
بے گناہی کی سزا پوچھ لیا کرتے ہیں
اِک توجہ کی نظر بھیک میں دینے والے
ظرفِ دامانِ گدا پوچھ لیا کرتے ہیں
وہ مسافر بھی ہیں جو عزمِ سفر سے پہلے
شہر کی آب و ہوا پوچھ لیا کرتے ہیں
کھلتے رہتے ہیں مرے زخم بھی پھولوں کی طرح
چھیڑنا ہو تو صبا، پوچھ لیا کرتے ہیں
جن سے ملنے کی دوبارہ ہو توقع بسمل
ایسے لوگوں کا پتہ پوچھ لیا کرتے ہیں

بجھے بجھے سے رہے ہم کسی کو پا کے بھی
نہ پائی روشنی ہم نے دیے جلا کے بھی
ڈھلی ہے وقت کی رفتار میری سانسوں میں
بدل رہے ہیں مرے ساتھ رُخ ہوا کے بھی
کسی کو اپنے غم دل کی ہو خبر کیسے
کہ ہم تو زخم چھپاتے ہیں مسکرا کے بھی
مہک اُٹھا مرے آنچل سے خوشبوؤں کی طرح
وہ ایک شخص کہ رکھا جسے چھپا کے بھی
جواب کوئی فلک سے بھی اب نہیں آتا
کسی نے روک لیے راستے دُعا کے بھی
مرا سکوت بھی تھا، چیخ کی طرح بسمل
لہولہو ہوئے جاتے ہیں لب صدا کے بھی

تصویرِ حوادث دل و جاں بنتے رہے ہیں
ہم اپنے زمانے کی زباں بنتے رہے ہیں
افسانۂ دل ہوتا رہا خود ہی مرتب
غم داغ بنے داغ نشاں بنتے رہے ہیں
چھوڑا ہے کئی بار اُمیدوں نے مرا ساتھ
کتنے ہی یقیں وہم و گماں بنتے رہے ہیں
چھیڑے ہیں اگر ساز پہ نغمے کبھی بسمل
حیرت ہے کہ نغمے بھی فغاں بنتے رہے ہیں

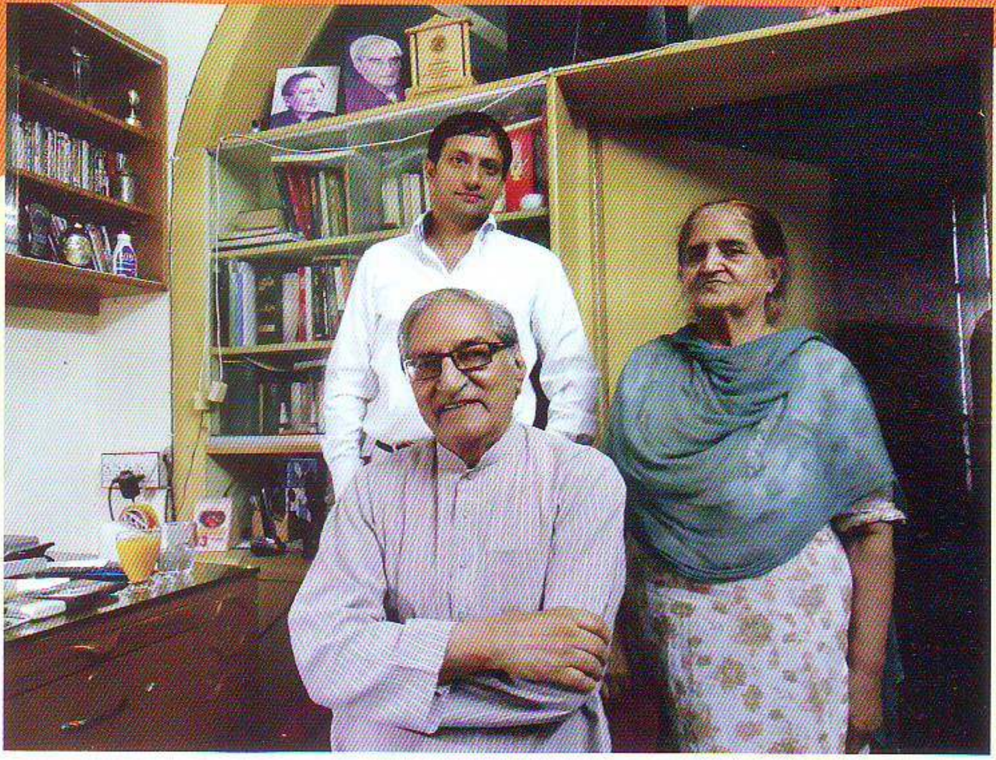

س: شاعری کے لیے آپ نے پنجابی زبان کا ہی انتخاب کیوں کیا۔اس کی کوئی خاص وجہ؟

جواب: پنجابی میری مادری زبان ہے اور میں نے محسوس کیا ہے کہ میرے لیے اپنی ماں بولی میں اظہار زیادہ آسان ہے۔ میں نے اس حوالے سے فیض صاحب سے بھی مشورہ کیا تو انہوں نے کہا ''خواب کس زبان میں دیکھتے ہو؟''

تو میں نے کہا ''پنجابی میں۔''

انہوں نے کہا ''بس پھر پنجابی میں ہی لکھو۔''

س: شاعری، ڈرامہ نگاری اور کالم نگاری میں آپ کو کون سا تعارف زیادہ پسند ہے۔

جواب: ڈرامے میں میری پذیرائی بہت زیادہ ہوئی لیکن میرے خیال میں کالم نگاری میں، میں بہتر انداز میں اظہار کرسکتا ہوں۔

س: ایک کالم نگار کے لیے غیر جانبدار ہونا کس حد تک ضروری ہے؟

جواب: میرے خیال میں ایک کالم نگار کے لیے غیر جانبداری ممکن نہیں ہے۔اگر میں جانبدار نہیں تو کالم نگاری کیوں کررہا ہوں۔بس یہ ہے کہ مجھے بے انصاف نہیں ہونا چاہیے۔ جو چور کے خلاف، جہالت کے خلاف ہے ناانصافی کے خلاف ہے وہ غیر جانبدار نہیں ہوسکتا۔کالم نگار کو چاہیے کہ وہ جس حد تک ممکن ہو انصاف سے کام لے۔

س: آج کے دور میں ترقی پسند تحریک کا وجود ہے؟

جواب: آج ترقی پسند تحریک اپنے اس انداز میں تو موجود نہیں لیکن وہ لوگ جنہوں نے اُس دور میں اس تحریک کے انداز کو اپنایا وہ آج نامور حیثیت میں موجود ہیں۔

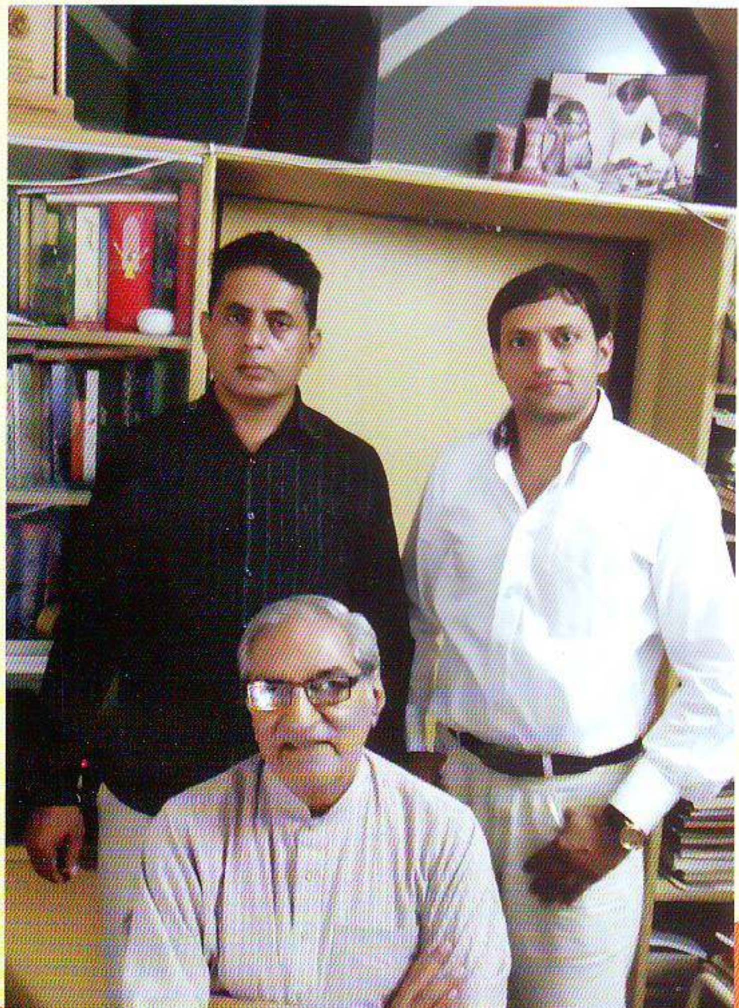

بقیہ انٹرویو صفحہ نمبر 48 پر

- ☒ شاعری دُنیا کا نازک ترین کام ہے۔
- ☒ ادب میں زندہ صرف وہی رہتا ہے جس نے کوئی زندہ مصرع کہا ہو۔
- ☒ میں نے قصداً شاعری نہیں کی ہے۔

ناروے میں مقیم نامور شاعر جمشید مسرور سے ابرار ندیم کا انٹرویو

جمشید مسرور کا نام اُردو ادب کے قارئین کے لیے کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ آپ ان چند پاکستانی شعراء میں سے ہیں جنھوں نے اُردو کے علاوہ کسی عالمی زبان میں شاعری کی ہو اور وہ شائع بھی یورپ میں ناروے جیسی جگہ سے ہوئی ہو۔ نارویجن سے اُردو میں دولسانی شعری مجموعوں کے علاوہ بھی آپ کی پانچ کتب شائع ہو چکی ہیں۔ ان میں سے ''شاخِ منظر'' اور ''میری خوشبوئیں میرے پھول'' شعری مجموعے ہیں جبکہ دو کتابیں لارس سوبے اور ارلنگ کٹرسن کے تراجم پر مشتمل ہیں۔ بے شمار عالمی اعزازات حاصل کرنے والے شاعر اور ادیب سے ہونے والی گفتگو بغیر کسی لمبی تمہید کے قارئین کی نذر ہے۔

ارژنگ: آپ ایک طویل عرصے سے ناروے میں اُردو ادب کی ترویج و ترقی کے لے کام کر رہے ہیں۔ ناروے کب اور کیسے پہنچے؟

جمشید مسرور: یہ قصہ تب کا ہے جب آتش جوان تھا۔ جوانی کی اُمنگ تھی۔ بار بار کے مارشل لاز سے تنگ آ گیا تھا۔ مغرب میں صرف مادی اور ٹیکنالوجی ہی نہیں وہاں پر جمہوریت بھی ہے جو کہ میرے نزدیک ایک نعمت ہی نہیں بنیادی انسانی حق بھی ہے۔ ضیاء الحق کے مارشل لاء نے میرا دل پاکستان سے اُچاٹ کر دیا تھا۔ میں ان دنوں سٹیٹ بنک لاہور میں کام کرتا تھا۔ میرے بعض دوست ان دنوں باہر چلے گئے تھے اور کچھ جا رہے تھے۔ انہی میں سے ایک دوست جو کوپن ہیگن میں مقیم تھا واپس آیا اور اپنے ساتھ مرسیڈیز گاڑی اور نئی نویلی دُلہن لے کر آ گیا۔ وہی دوست میرے ملک چھوڑنے کا سبب بنا۔ جب وہ واپس کوپن ہیگن جانے لگا تو مجھے بھی اپنے ساتھ ہی لے گیا۔ کچھ دیر میں اُسی دوست کے ہاں ٹھہرا۔ پھر وہاں سے ناروے چلا گیا۔ ناروے میں مجھے ایک بڑی اچھی فیملی کے ساتھ رابطے کا موقع ملا جس نے میری بے انتہا مدد کی اور مجھ سے کہا کہ ناروے میں ہی رُک جاؤں اور میں ٹھہر گیا گو کہ اُس کے بعد بھی پاکستان گیا مگر واپس آ گیا۔ بس تب سے یہیں پر ہوں۔

ارژنگ: شعر کہنا کب شروع کیا؟

جمشید مسرور: بڑی آسانی سے کہہ سکتا ہوں کہ شعر میرے خون میں ہے۔ میرے دادا مولوی پروفیسر مسرور کپورتھلوی بڑے اچھے شاعر تھے۔ آپ صاحب دیوان تھے۔1926ء میں آپ کا دیوان ''نوائے رنجور'' کے نام سے شائع ہوا۔ میں آپ کو انکا ایک شعر سناتا ہوں:

نقش اس کا کہیں نہ مٹ جائے
میں رگڑتا نہیں جبین نیاز

والد محترم ڈاکٹر مسرور کپورتھلوی اعلیٰ پائے کے شاعر تھے۔ حفیظ جالندھری اور ہری چند اختر جیسے لوگ ان کے ذاتی دوستوں میں شامل تھے۔ ان کا دیوان میرے پاس پڑا ہوا ہے مگر ابھی تک چھپوا نہیں سکا۔ انشاء اللہ جیسے ہی فرصت ملتی ہے ضرور چھپواؤں گا۔

جہاں تک میرا تعلق ہے، بہت ہی بچپن سے میرا جھکاؤ شاعری کی طرف تھا۔ آٹھ سال کی عمر میں میں نے پہلا شعر کہا تھا جس پر میرے بہن بھائیوں نے میرا مذاق بھی اُڑایا۔ شعر تو وہ بس ایسے ہی تھا لیکن شعر کے تمام فنی تقاضوں پر پورا اُترتا تھا۔ بہرحال یہ میری شاعرانہ زندگی کی ابتداء تھی۔

ارژنگ: آپ کی اب تک کتنی اور کون کون سی کتابیں شائع ہو چکی ہیں؟

جمشید مسرور: پنجابی شعری مجموعہ تیار ہے۔ مگر ابھی شائع نہیں ہوا۔ اس کے علاوہ تقریباً سات کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ زیادہ تر شاعری کی کتب ہیں اور دو منظوم تراجم ہیں جو میں نے نارویجن شاعروں اور ڈرامہ نگاروں کے اُردو زبان میں کیے ہیں۔ ''لمحوں کے سمندر'' اور ''پچھلے برس کی دھوپ'' کے نام سے میری ذولسانی شاعری کی کتابیں بھی یہاں اوسلو سے ہی شائع ہوئی ہیں۔ گو کہ شاعری کا آغاز تو بچپن سے ہی کر دیا تھا مگر میری پہلی کتاب چالیس برس کی عمر میں شائع ہوئی۔ یہاں میں بتاتا چلوں کہ ناروے میں کتاب چھپوانا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ یہاں پر پبلشرز مصنف کو سوئی کے ناکے سے گزارتے ہیں۔ میرے ساتھ بھی یہی معاملہ ہوا۔ جب میری پہلی ذولسانی کتاب شائع ہوئی نارویجن اور اردو زبان میں بیک وقت چھپنے والی میری دوسری کتاب کی اشاعت کے

بقیہ انٹرویو صفحہ نمبر 48 پر

ضمیر طالب / اوسلو (ناروے)

تم اپنے جسم کے اِک کونے میں پڑے رہتے
ہوا نہ ہوتا اگر اس طرف گزر میرا

ضمیر طالب جدید غزل کا ایک نہایت معتبر نام ہے۔ اُن کی شاعری اوس میں بھیگے ہوئے پھولوں کی طرح تازہ اور شگفتہ ہے۔ فرسودہ مضامین کو وہ اپنے اندازِ بیاں سے نیا اور چمکدار بنا دیتے ہیں۔ اُن کی غزل ہمارے عہد میں لکھی جانے والی غزل میں منفرد ہے۔ وہ زندگی کا گہرا شعور اور ادراک رکھتے ہیں۔ اپنے مشاہدات اور تجربات کو شاعری کا حصہ بناتے ہیں۔ دیارِ غیر میں ہونے والی شاعری میں ضمیر طالب کی شاعری اپنے اسلوب کے لحاظ سے جداگانہ حیثیت رکھتی ہے۔

چراغ بجھ ہی گیا کانپتے ہوئے آخر
وہ موڑ مڑ ہی گیا دیکھتے ہوئے آخر

ہر ایک موڑ پہ پرچھائیاں ملیں مجھ کو
کٹی حیات بدن ڈھونڈتے ہوئے آخر

تمام جسم کو ہی بھربھرا سا کر بیٹھا
میں بند آنکھوں پہ اِک باندھتے ہوئے آخر

میں جانتا ہوں اُسے، وہ بھی میرے جیسا ہے
وہ توڑ دے گا مجھے موڑتے ہوئے آخر

میں آگ پانی ہوا مٹی سب کو چھوڑ گیا
ہنر وہ ہاتھ لگا ناچتے ہوئے آخر

پلٹ کے وار مجھے کرنا پڑ گیا ہے ضمیرؔ
زمین ختم ہوئی بھاگتے ہوئے آخر

اسی لیے تو مجھے چہرہ بنانا پڑتا ہے
کہ آئنے کو بھی کچھ تو دکھانا پڑتا ہے

اُداسی اپنی کا مجھ کو سبب نہیں معلوم
مگر جو پوچھ لے اُس کو بتانا پڑتا ہے

پرانے کاغذوں کا اور کیا کیا جائے
زیادہ ہونے لگیں تو جلانا پڑتا ہے

بدن اُٹھانے کی طاقت نہیں ہے پیروں میں
سو میرے سائے کو یہ بوجھ اُٹھانا پڑتا ہے

قبا پہن کے بھی کچھ لوگ عریاں رہتے ہیں
پھر اپنے گرد اُنہیں گھر بنانا پڑتا ہے

انہی پرانی گزرگاہوں سے گزر کے ضمیرؔ
نئے سفر پہ کہیں روز جانا پڑتا ہے

مرا زیاں ترے اقرار سے زیادہ ہے
کہ میرا زخم ترے وار سے زیادہ ہے

ابھی میں تجھ کو فقط یہ بتانے آیا ہوں
جو بات باقی ہے اظہار سے زیادہ ہے

ہمارے مرنے سے بھی ختم ہو ضروری نہیں
ہمارا مسئلہ تلوار سے زیادہ ہے

مجھے کہانی کو دینا ہے ایک موڑ نیا
سو میرا کام بھی کردار سے زیادہ ہے

ہے دستیاب سبھی کچھ مگر کوئی کوئی چیز
ابھی بساطِ خریدار سے زیادہ ہے

بنانے پڑتے ہیں دن رات مجھ کو ہاتھوں سے
مرا ہنر کسی معمار سے زیادہ ہے

مرے وجود میں طوفان اُٹھ رہے ہیں ضمیرؔ
مری نمو مری رفتار سے زیادہ ہے

قریب آ میں تجھے دیکھوں اپنے ہاتھوں سے
کہ اعتبار مرا اُٹھ گیا ہے آنکھوں سے

لگی ہوئی ہے ابھی رات میرے کپڑوں پر
گزر کے آیا ہوں ظلمت کے اتنے پہروں سے

مجھے یقیں بھی نہیں ہے ادھر ہی جانا تھا
چپک گیا ہے یونہی رستہ میرے پیروں سے

کسی کے نقش قدم پر میں چل نہیں سکتا
یہی سبب ہے کہ چلتا ہوں بچ کے رستوں سے

عجیب موسموں کا ہوتا ہے اثر مجھ پر
مرا خیال ہے میں مختلف ہوں لوگوں سے

تمہارا لمس بہت دیر تک سنبھالتا ہوں
میں تم سے مل کے نہیں ملتا اور لوگوں سے

ضمیرؔ بھر گیا اِک شخص اس قدر مجھ میں
چھلکتا رہتا ہے بے اختیار ہونٹوں سے

زمیں پہ پاؤں ہیں اور آسماں پہ سر میرا
یہ کائنات نہیں بن سکی ہے گھر میرا

میں ننگے پاؤں بہت دیر گھومتا رہا ہوں
تمہارے شہر کی مٹی میں ہے اثر میرا

تم اپنے جسم کے اِک کونے میں پڑے رہتے
ہوا نہ ہوتا اگر اس طرف گزر میرا

جو اینٹ اُبھری تھی دیوار سے ذرا باہر
لہو لہان کیا ہے اُسی نے سر میرا

چراغ مجھ میں ہے یا میں چراغ میں ہوں ضمیرؔ
لگا ہوا ہے تماشہ اِدھر اُدھر میرا

نیلما ناہید درانی / سویڈن

نیلما کی شاعری پڑھتے ہوئے یوں لگتا ہے جیسے ایک دُکھی شخص اپنی بپتا سنا رہا ہو۔ ایسی بپتا جس میں اُس کے ذاتی دُکھ بھی شامل ہیں اور اس کے علاوہ وہ تمام دُکھ جو اردگرد کے ماحول میں کیکٹس کی طرح بازو پھیلائے کھڑے ہیں۔ فریاد کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس کی کوئی لے نہیں ہوتی۔ دراصل نالے کا پابند لے نہ ہونا ہی اُس کی اثر پذیری کا باعث بنتا ہے۔ نیلما کی شاعری بھی اُس مخصوص آہنگ سے مرکب ہے جو کسی ایک سانچے میں ڈھلنے کی بجائے مختلف پیکروں میں ہمارے سامنے آتی ہے۔ یہ ایک نئی قسم کی شاعری ہے جس کی لذت میں شرکت کے لیے ذوق ڈویلپ کرنا پڑتا ہے۔ میں شاعری کی اس لذت میں شریک ہوں اور شاعری کی اثر پذیری کے حوالے سے مجھ پر نیلما کا شکریہ واجب ہے۔ (عطاء الحق قاسمی)

جب تک آنکھیں زندہ ہیں

جب تک آنکھیں زندہ ہیں
جب تک دل میں دھڑکن ہے
جب تک ذہن میں سوچیں ہیں
جب تک لب پر باتیں ہیں
میں تجھ کو ہی دیکھا کروں گی
دھڑکن دھڑکن سوچا کروں گی
تیرا ہی دم بھرتی رہوں گی
تیری باتیں کرتی رہوں گی

پیار، وفا اور رشتے، ناطے

پیار، وفا اور رشتے ناطے
دُنیا کے بازاروں میں
ہر شے کی اِک قیمت ہے
لیکن میرے ہاتھ بھی خالی
جیب بھی خالی
دامن خالی
میں تو ایسا گاہک ہوں جو
ہر شوکیس کے سامنے رُک کر
آہیں بھرتا رہتا ہے
خود سے لڑتا رہتا ہے

جو لوگ میرے ہمراہ چلے

جو لوگ میرے ہمراہ چلے
اُن کو تو زمانہ جانتا ہے
جو لوگ میرے سپنوں میں رہے
اُن کو تو کوئی نہ جان سکا

یہ کیسی اندھی دُنیا ہے؟
ظاہر کی باتیں کرتی ہے
جو اس کی سمجھ میں آ نہ سکے
اُس شخص کو رُسوا کرتی ہے

پہلا بوسہ

سارے شہر کے جگنوؤں نے دیپ جلائے
اور تتلیوں نے گانے گائے
پھولوں، رنگوں، خوشبوؤں
اور ٹھنڈک کی برسات میں
لرزتے، کانپتے، جسموں نے
سانسوں اور دھڑکن کی لے پر
اِک دوجے کے ہونٹوں کو
امرت رس کے جام پلائے

کاش وہ روزِ حشر بھی آئے

کاش وہ روزِ حشر بھی آئے
تو میرے ہمراہ کھڑا ہو
ساری دُنیا پتھر لے کر
جب مجھ کو سنگسار کرے
تو اپنی بانہوں میں چھپا کر
پھر بھی مجھ کو پیار کرے

میرے گھر میں بھوت بسیرا کرتے ہیں

میرے گھر میں بھوت بسیرا کرتے ہیں
آدھی رات کو
اُلٹے پیروں والی چڑیلیں
وحشت اور اندھیارے لے کر
زور سے چیخا کرتی ہیں
اِک بوڑھے پاگل جن کی
رُوح بھی گھوما کرتی ہے
موٹی ڈائن کے ہونٹوں سے
آگ برستی رہتی ہے
اور میں سب آسیب زدہ
لوگوں میں تنہا رہتی ہوں

قمر رضا شہزاد / کبیروالہ

یہ کیسا گریہ و ماتم یہاں بپا ہے کہ دل   ہر ایک یوم کو یومِ عزا سمجھتا ہے

مصرعے کی تعمیر وترتیب کے بنیادی وصف سے متصف ہونے اوراس کے جملہ اسرار ورموز سے قمر رضا شہزاد کی حیرت انگیز شناسائی اور جدید حسیت کا وفور اسے اپنے سینئر اور ہم عصر حریفوں سے ممتاز، مختلف اوران سب میں شمار کرتے ہوئے بھی اس کوایک الگ تھلگ مقام تفویض کرتا دکھائی دیتا ہے۔ جبکہ تازگی اور تاب وتوانائی اس کا ایسا ہتھیار ہے جو کاری تو ہے ہی، اپنے عدو کی پسپائی بھی اختیار کرنے پر مجبور کردینے کی طاقت رکھتا ہے۔ (ظفر اقبال)

کوئی دیوار گراتا نہیں میں
راستہ خود ہی بناتا نہیں میں
اتنی وحشت ہے رفاقت سے مجھے
اپنے ہمراہ بھی جاتا نہیں میں
یاد رکھتا ہوں بہت سی باتیں
ہاں مگر یاد دلاتا نہیں میں
چھیڑ دیتا ہوں کہانی اپنی
اور انجام بتاتا نہیں میں
یہ بھی دُنیا کو خبر ہے اے دوست
کیوں کناروں کو ملاتا نہیں میں
کون ہے میرے تعاقب میں یہاں
کس لیے پاؤں اُٹھاتا نہیں میں
توڑتا رہتا ہوں خود کو شہزاد
اور پھر کچھ بھی بناتا نہیں میں

جو اپنے دل کو ہی سب سے بڑا سمجھتا ہے
وہ تیری وسعتِ دنیا کو کیا سمجھتا ہے
یہ کیسا گریہ و ماتم یہاں بپا ہے کہ دل
ہر ایک یوم کو یومِ عزا سمجھتا ہے
کسی کسی پہ عیاں ہے جہانِ صبر و دُعا
کوئی کوئی ہے جو یہ سلسلہ سمجھتا ہے

مرے خیال میں اتنی بری نہیں دُنیا
یہ ہر کوئی اسے جتنا برا سمجھتا ہے
بھٹکنے والے سے ہوتی ہے طے مسافتِ عشق
جو بے خبر ہے وہی راستہ سمجھتا ہے
میں کیوں صدائیں لگاتا ہوں چارسو شہزاد
یہ بھید ڈار سے بچھڑا ہوا سمجھتا ہے

لرزتے، ٹوٹتے گرتے ہوئے جہاں سے نکل
زیادہ خوفزدہ ہے تو اس مکاں سے نکل
ہمارے دل کا تعلق نہیں زمانے سے
سو اپنی خواہش دُنیا اُٹھا یہاں سے نکل
ترے جمال کی لو تیرے بعد رہ جائے
دیا جلاتا ہوا اس جہانِ جاں سے نکل
میں ربِ نور سے محو کلام ہوں سرِ شام
سوائے چراغِ دُعا تو بھی درمیاں سے نکل
اب اس کے بعد قیامت ہے تو بھی اے شہزاد
دُعائیں پڑھتا ہوا شہر بے اماں سے نکل

یہ جو مجھ کو گرا دیا گیا ہے
آپ کو راستہ دیا گیا ہے

کوئی تیری مثال ہی نہ رہے
آئینہ بھی ہٹا دیا گیا ہے
دکھ تو یہ ہے ترے بچھڑنے کا دُکھ
آنسوؤں میں بہا دیا گیا ہے
اِک دل ہی تھا ضوفشاں سرِ شام
یہ دیا بھی بجھا دیا گیا ہے
مجھ کو اس دشتِ عشق میں شہزاد
قیس کا مرتبہ دیا گیا ہے

کوئی اس خاک پر کہاں رہے گا
اِک ترا حُسن جاوداں رہے گا
طاق میں رکھ دیا گیا ہے چراغ
جانے کب تک وہ ضوفشاں رہے گا
ہم تو ہو جائیں گے الاؤ کی نذر
اور تو زیبِ داستاں رہے گا
آگ تو بجھ ہی جائے گی لیکن
عمر بھر آنکھ میں دھواں رہے گا
عشق آزار ہی سہی شہزاد
یہ مرے خون میں رواں رہے گا

شاہین عباس / شیخوپورہ

ہم نے توہین کی، قیام کیا   اِس سفر میں قیام تھا ہی نہیں

۸۰ء کی دہائی کے بعد جو شعراء منظر عام پر آئے اُن میں شاہین عباس کا نام سرفہرست ہے۔ان کی شاعری نے جدید غزل میں نئے امکانات تلاش کیے ہیں۔اپنے منفرد موضوعات اور اسلوب کے باعث اُن کی شاعری نے آج کے نقاد کو اپنی طرف متوجہ کیا ہے۔اُن کا شمار پاکستان کے اُن چند گنتی کے نوجوان شعراء میں ہوتا ہے جس سے جدید اُردو غزل کی آب و تاب میں اضافہ ہوا ہے۔اُن کے متعدد شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔جن کو ادبی اور عوامی حلقوں میں بھرپور پذیرائی ملی ہے۔

نقش تھا اور نام تھا ہی نہیں
یعنی میں اِتنا عام تھا ہی نہیں
خواب سے کام تھا وہاں کہ جہاں
خواب کا کوئی کام تھا ہی نہیں
سب خبر کرنے والوں پر افسوس
یہ خبر کا مقام تھا ہی نہیں
تہ بہ تہ انتقام تھا سرِ خاک
انہدام ، انہدام تھا ہی نہیں
ہم نے توہین کی ، قیام کیا
اِس سفر میں قیام تھا ہی نہیں
اب تو ہے پر ہمارے وقتوں میں
شیشہ ء صبح شام تھا ہی نہیں
وہ تو ہم نے کہا کہ تم بھی ہو
ورنہ کوئی نظام تھا ہی نہیں
عشق آغاز ہی تھا آخر تک
عشق کا اختتام تھا ہی نہیں

ایک سایہ گھٹتا بڑھتا وقت بتلاتا رہا
اور میں اندازے سے ہی آتا رہا، جاتا رہا
پہلے ٹھوکر کھائی پھر میں چوٹ سہلاتا رہا
آدمی اک بار کہلایا ، تو کہلاتا رہا
رات، رخصت تھی کہ نابینائی کو ثابت کریں
میں اندھیرے سے، اندھیرا مجھ سے ٹکراتا رہا
خالی کمروں میں پڑا میں خالی آنگن میں کھڑا
جانے کس کس کو خسارہ اپنا گنواتا رہا
راستے میں لوگ ملتے تھے جواب ملتے نہیں
راستہ جس خواب کو جاتا تھا بس جاتا رہا
اِتنا پانی آ چکا تھا میرے قابو میں کہ بس
سب پیالے بھر چکے تھے میں سب الٹاتا رہا
اک ستارہ اپنی غفلت سے کہیں ڈوبا اُدھر
اور اِدھر، میں کیا بتاؤں، میرا نام آتا رہا

اوپر جو پرند گا رہا ہے
نیچے کا مذاق اڑا رہا ہے
مٹی کا بنایا نقش اُس نے
اب نقش کا کیا بنا رہا ہے
گھر بھر کو یہ طاقچہ مبارک
خود چل کے چراغ آ رہا ہے
اب دوری حضوری کیا ہے صاحب
بس جسم کو جسم کھا رہا ہے
یہ وقت کا خاص آدمی تھا
بے وقت جو گھر کو جا رہا ہے
اب میں نہیں راہ میں تو رستہ
میری جگہ خاک اڑا رہا ہے
دروازے سے یوں جڑا ہوا شخص
دیواروں کا دکھ بڑھا رہا ہے
اوّل وہ غلط بنانے والا
آخر کو غلط مٹا رہا ہے
وہ قافلہ آ سکا نہیں کیوں
رستہ بھی تو واں سے آ رہا ہے

مجھے نام کرنا تھا زخم بھر ، نہیں کر سکا
میں بدن سا ہو کے ، بدن کو سر نہیں کر سکا
شبِ ہجر جیسی رواں تھی، ویسی رواں رہی
میں کوئی بھی لہر اِدھر اُدھر نہیں کر سکا
کہیں پاؤں پاؤں پہ گام گام کا انہدام
میں تمام کرتا پھرا ، مگر نہیں کر سکا
مرے گرد باد سب ایک دشت میں گھُل گئے
میں بھروسہ پھر کسی دشت پر نہیں کر سکا
مرے ذمے تھے وہ گزر بسر کے معاملے
میں گزر چلا ، پہ گزر بسر نہیں کر سکا
مرے ارد گرد خلا رہا کہ خدا رہا
یہ وہ عیب تھا جسے میں ہنر نہیں کر سکا

عرفانہ امر / گوجرانوالہ

جن گلابوں کو بکھرنا تھا مہک اُٹھے ہیں
آج خوشبو تری پہنچی ہے ہوا سے پہلے

عرفانہ امر کی شاعری کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ نسائی جذبوں کی ترجمان ہے۔ اپنے اندر کے سفر کی شاعری ہے۔ عورت کی سوچ کی ایک کہکشاں ہے، ہر غزل کے اندر صدیوں کی روتی کرلاتی احتجاج کرتی عورت نظر آتی ہے۔ عورت کا اپنے تمام تر خفی و جلی جذبوں کے ساتھ عورت نظر آنا ہی اس کا سب سے بڑا حسن ہے

جسے دیکھو وہی ناراض سا ہے
نجانے شہر کے پانی میں کیا ہے
نہیں اِک زہر باتوں میں گھلا ہے
یہاں تو ایک ہنگامہ بپا ہے
مرے ہاتھوں کی خوشبو سے کھلا ہے
ترے در میں ابھی بوئے وفا ہے
دیے سے چھین لے گی لو اچانک
یہی سرکش ہوا کا فیصلہ ہے
محبت کل بھی یوں ہی دربدر تھی
محبت آج بھی بے آسرا ہے
مجھے خود سے بھی یہ اُمید کب تھی
یہ دل شاید کہیں پھر مبتلا ہے
وہ جائے تو اُجڑ جاتی ہے محفل
میں جاؤں تو بھلا جاتا ہی کیا ہے
اُتر جائے گا اک دن دل سے وہ بھی
ابھی تو صرف نظروں سے گرا ہے

چور چھپ کر دلوں میں رہتے ہیں
لوگ اب یوں گھروں میں رہتے ہیں
جو تری قربتوں میں رہتے ہیں
گویا وہ جنتوں میں رہتے ہیں
دُھند میں آنسوؤں میں رہتے ہیں
ہم یہیں بادلوں میں رہتے ہیں
آپ آ جائیں شوق سے آئیں
ہم ذرا خلوتوں میں رہتے ہیں
کیا خبر وہ ہمیں نہ پہچانیں
ہم انہی اُلجھنوں میں رہتے ہیں
ایسے بس جاؤ اپنی آنکھوں میں
رنگ جیسے گلوں میں رہتے ہیں

آنکھ بھر آئی مری، عذرِ جفا سے پہلے
دیکھتا ہے تو سنے حرفِ دعا سے پہلے
دل کو روکا تھا بہت پہلی خطا سے پہلے
جن گلابوں کو بکھرنا تھا مہک اُٹھے ہیں
آج خوشبو تری پہنچی ہے ہوا سے پہلے
بہر ترمیم کروں پیش یہ دستورِ حیات
کاش مل جائے خدا، روزِ جزا سے پہلے
اب تو وہ آنکھ ملاتے ہوئے گھبراتا ہے
ہاں وہی شخص جو دیتا تھا دلاسے، پہلے

لاکھ کرتا رہا بہانے دل
رات پھر آ گئی جلانے دل
اس قدر ٹھوکروں کی تاب کہاں
دل ہے، دل ہے، ارے زمانے! دل
تو بھی تو داغ داغ ہے یہ بتا
آئے احسان گر جتانے، دل
تو اسے بھول جا کہ چلتے ہیں
ایک دُنیا نئی بسانے دل
سوچتے ہیں تری قبا ہو جائیں
بن رہا ہے یہ تانے بانے دل
گفتہ یار کو ترستے ہیں
کیا کریں ہم تریت رانے دل
وہ جو کہتا ہے ہم کسی کے نہیں
آپ اس سے لگے، لگانے دل

صحن گلشن میں نہیں وسعتِ صحرا میں ملو
ماورائے غم جاں اور ہی دُنیا میں ملو
خوشبوئیں ہوش اُڑاتی ہیں اگر حائل ہوں
چادرِ گل سے نکل، جامۂ سادہ میں ملو
ہم تے پابند در و بام و دریچہ سو رہے
اِک خلش سی تھی کبھی دشتِ تمنا میں ملو
''گرمیٔ شوق سے یا آتش محرومی سے''
جل اُٹھیں زخم، اسی رنگِ تماشا میں ملو
مئے تنہائی سے لبریز ہے پیمانۂ جاں
شبِ وعدہ میں سلگتی رگِ مینا میں ملو
ایک ہی ڈھنگ سے ملتے ہیں محبت والے
تم سر راہ ملو، دیر کہ کعبہ میں ملو

سعید الظفر صدیقی / کراچی

اپنے اندر سے نکلنے کی کسے فرصت تھی
ہم خدا جانے درِ یار تک آئے کیسے

سعید الظفر صدیقی کی غزلوں کا مطالعہ کرتے ہوئے احساسِ جمال، عرفانِ حیات اور معراجِ فکر ونظر کا وہ شعور نظر آتا ہے جنہیں ہم تغزل کی لطافتوں کا خاصہ تصور کرتے ہیں۔ آپ کے یہاں بات سے بات نکالنے کا عیب نظر نہیں آتا بلکہ خیالات کی تازگی اور خوب صورتی، نئے نئے خیالات اور ان میں پوشیدہ کیفیت اور تفکر آپ کی آئینہ دار ہے۔ شعر دراصل حیاتی تنقید کے اظہار کا نام ہے۔ ماضی کی روایت، حال کی کیفیات اور مستقبل کی توقعات، یہ تینوں عنصر ہی شاعری کا محور ہیں جن کی تصویریں آپ کی شاعری میں نمایاں نظر آتی ہیں۔ (جاوید رسول)

سایہ کہیں کسی کو میسر نہیں ہے کیا
سر پر جو آسمان تھا سر پر نہیں ہے کیا
اِک دوسرے سے اپنا پتا پوچھتے ہیں لوگ
اب کوئی اپنے آپ کے اندر نہیں ہے کیا
ہنستا ہے کوئی کھل کے نہ روتا ہے ٹوٹ کر
بستی میں کوئی مست قلندر نہیں ہے کیا
اتنی شکایتیں ہیں زمانے سے کس لیے
ساقی نہیں ہے بادہ و ساغر نہیں ہے کیا
چہرہ خود اپنا میں نے تراشا ہے ایک عمر
ہاتھوں میں میرے اب بھی مقدر نہیں ہے کیا
ہم زندگی تیرے لیے جاں سے گزر گئے
اب بھی ترا حساب برابر نہیں ہے کیا
کاندھوں پہ بے گھری لیے پھرتے ہیں در بہ در
اس شہر میں کسی کا کوئی گھر نہیں ہے کیا
اس دورِ ناسپاس کا ہونے سے تو سعید
مٹی میں ڈوب جائیں یہ بہتر نہیں ہے کیا

گھر کی دہلیز سے دربار تک آئے کیسے
آپ اُس پار سے اس پار تک آئے کیسے
تم نے تو سارے صحیفوں کو جلا ڈالا تھا
یہ نوشتے در و دیوار تک آئے کیسے

اپنے اندر سے نکلنے کی کسے فرصت تھی
ہم خدا جانے درِ یار تک آئے کیسے
کوئی پوچھے تو سہی جا کے یہ شہزادے سے
شام سے مصر کے بازار تک آئے کیسے
کچھ فسانے گلی کوچوں سے نکل کر آخر
آپ کے گیسو و رُخسار تک آئے کیسے
کل جو اس شہر میں تھے عیسیٰ نفس آج وہی
پا برہنہ رسن و دار تک آئے کیسے
آپ تو شہر کے خوش رنگ خداؤں میں سے تھے
آپ مجھ جیسے گنہ گار تک آئے کیسے
یہ تو بس شیخ مکرم ہی کو ہوگا معلوم
دست بستہ تھے جو دستار تک آئے کیسے
دُھوپ چڑھتی تھی تو ہم رقص کیا کرتے تھے
یہ قدم سایۂ دیوار تک آئے کیسے

ہمارے وعدۂ قول و قرار چھوڑو بھی
محبتیں نہیں کرتے شمار چھوڑو بھی
تم اب یہ ذکرِ غم روزگار چھوڑو بھی
ہمارا ٹوٹ رہا ہے خمار چھوڑو بھی
تلاشِ نکہت و رنگ و نکھار چھوڑو بھی
گزر چکی ہے کبھی کی بہار چھوڑو بھی

تسلیوں پہ طبیعت اُلجھنے لگتی ہے
کرو نہ پرسشِ غم بار بار چھوڑو بھی
یہی سلگتی ہوئی دُھوپ اب مقدر ہے
کہاں گئے وہ شجر سایہ دار چھوڑو بھی
کہاں تلک کوئی تنہائیوں کے دُکھ جھیلے
یہ بستیوں کو یہ شہروں کو یار چھوڑو بھی
کسی کے رنگ میں ہم کیوں نہائے جاتے ہیں
کیا کسی پہ ہے کیوں اعتبار چھوڑو بھی
محبتوں کے یہ رشتے بہت مقدس ہیں
نہ چل سکے گا یہاں کاروبار چھوڑو بھی
تمہاری بزم میں تو لوگ پارسا ہیں بہت
ہمارا ذکر ہمارا شمار چھوڑو بھی

بھروسے کا دلِ وحشی نہیں ہے
یہ ظالم تو خود اپنا بھی نہیں ہے
کسی کے سامنے آ جائیں لے کر
ہمارا دُکھ اب ایسا بھی نہیں ہے
ہمیں تو دل کے اندر جھانکنا ہے
یہ چہرے دیکھنا کافی نہیں ہے
جو دُنیا راس تم کو آ گئی ہے
ہمارے حق میں تو اچھی نہیں ہے

نزہت عباسی / کراچی

کبھی منزل پہ جانے کے نشاں تک نہیں ملتے
جو رستوں میں بھٹک جائیں تو رستے مار دیتے ہیں

ڈاکٹر نزہت عباسی ۲۸ جون ۱۹۷۱ء کو کراچی میں پیدا ہوئیں۔ آپ کا تعلق علمی و ادبی گھرانے سے ہے۔ اسی وجہ سے بچپن ہی سے علم و ادب کی طرف راغب ہیں۔ شاعری کا مجموعہ ''سکوت'' کے نام سے ۲۰۰۵ء میں شائع ہوا۔ دوسرا مجموعہ زیرِ ترتیب ہے۔ آپ کے تحقیقی و تنقیدی مضامین معتبر ادبی جرائد میں شائع ہوتے ہیں۔ آپ ماہنامہ قومی زبان (انجمن ترقی اُردو) میں کتابوں پر تبصرہ بھی کرتی ہیں۔ مشاعروں، ادبی پروگراموں کی نظامت کے فرائض بھی سرانجام دیتی ہیں۔ میٹرو ون ٹی وی کے ادبی پروگرام ''حاصل مطالعہ'' کی نظامت کرتی ہیں۔ جو ہر جمعرات کو ۱۱:۳۰ پر نشر ہوتا ہے۔ متعدد کانفرنسز میں شرکت کر کے تحقیقی مقالے پیش کر چکی ہیں۔ جن میں شیخ ایاز انٹرنیشنل کانفرنس سندھ یونیورسٹی جام شورو، عالمی اُردو کانفرنس آرٹس کونسل کراچی، سندھی ادبی کانفرنس جامعہ کراچی شامل ہیں۔ نزہت عباسی آرٹس کونسل، پاکستان رائٹرز گلڈ، بزمِ سائنسی ادب، برداشت اور انجمن اتحادِ عباسیہ کی رُکن ہیں۔ ۲۰۱۱ء میں جناح یونیورسٹی برائے خواتین سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ انہوں نے اپنا تحقیقی مقالہ بعنوان ''اُردو کے افسانوی ادب میں نسائی لب و لہجہ'' تحریر کیا۔

ہے یقیں نہ تم سا اب خوش جمال دیکھیں گے
جب بھی تم کو دیکھیں گے بے مثال دیکھیں گے
قتل و خون کے منظر روز دیکھنے والے
کیا عروج دیکھیں گے کیا زوال دیکھیں گے
اب لہو ہمارا ہی اس کے کام آئے گا
ہم زمیں کے زخموں کا اندمال دیکھیں گے
ہم پہ آج یہ عائد فردِ جرم کس نے کی
منصفی کا تیرے اب ہم کمال دیکھیں گے
کیا جواب لکھیں گے ہاتھ میں قلم لیکن
زندگی کے پرچے کا ہر سوال دیکھیں گے
اب بساط پر بازی جان کی لگا دی ہے
آخری یہ پیاروں کی ہم بھی چال دیکھیں گے

قولِ فیصل نہیں تردید کی گنجائش ہے
میری تحریر پہ تنقید کی گنجائش ہے
قصہ زیست گو تکمیل تک آ پہنچا ہے
پھر بھی لگتا ہے کہ تمہید کی گنجائش ہے
بارہا یاد دلائیں کہ ہمیں بھولے رہیں
اس میں بھی آپ کو تاکید کی گنجائش ہے
آج کچھ ذکر بھی ہو جائے شبِ ہجراں کا
قلبِ قرطاس میں تسوید کی گنجائش ہے

وسعتِ کون و مکاں کی کوئی حد بھی ہے کہاں
چشمِ حیرت ہے تو پھر دید کی گنجائش ہے
ہم بھی اس دورِ پر آشوب کے شاعر ہیں تو پھر
اپنے اسلوب میں تقلید کی گنجائش ہے

رویے مار دیتے ہیں یہ لہجے مار دیتے ہیں
وہی جو جان سے پیارے تھے رشتے مار دیتے ہیں
کبھی برسوں گزرنے پر کہیں بھی کچھ نہیں ہوتا
کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ لمحے مار دیتے ہیں
کہانی ختم ہوتی ہے کبھی انجام سے پہلے
ادھورے نامکمل سے یہ قصے مار دیتے ہیں
کبھی منزل پہ جانے کے نشاں تک بھی نہیں ملتے
جو رستوں میں بھٹک جائیں تو رستے مار دیتے ہیں
مجھے اکثر یہ لگتا ہے کہ جیسے ہوں نہیں ہوں میں
مجھے ہونے نہ ہونے کے یہ خدشے مار دیتے ہیں
بہت احساں جتانے سے تعلق ٹوٹ جاتا ہے
بہت ایثار و قربانی کے جذبے مار دیتے ہیں
وہ حصہ کاٹ ڈالا زہر کا خدشہ رہا جس میں
جو باقی رہ گئے مجھ میں وہ حصے مار دیتے ہیں
کبھی مرنے سے پہلے بھی بشر کو مرنا پڑتا ہے
جو ملتے ہیں یہاں جینے کے صدمے مار دیتے ہیں

ہزاروں وار غیروں کے سہے جاتے ہیں ہنس ہنس کے
مگر اپنوں کے تشنع اور طعنے مار دیتے ہیں
جو آنکھوں میں رہیں نزہت وہی تو خواب اچھے ہیں
جنہیں تعبیر مل جائے وہ سپنے مار دیتے ہیں

ہماری سادہ دلی تھی تمہاری بات نہیں
ہمیں میں کوئی کمی تھی تمہاری بات نہیں
ہمارے اپنے ہی دکھ تھے ہمیں کو رونا تھا
تمہاری اپنی خوشی تھی تمہاری بات نہیں
عذاب سارے جنوں و خرد کے اپنے تھے
تمہیں تو بے خبری تھی تمہاری بات نہیں
بہت طویل تھی مدت فراق لمحوں کی
کہاں پہ آ کے رُکی تھی تمہاری بات نہیں
میرے چمن کی کلی اب دُھواں دُھواں یوں ہے
ہتھیلی جل کے بجھی تھی تمہاری بات نہیں
بدل گئی تھی کئی بار گفتگو یک دم
یہ بات تم نے کہی تھی تمہاری بات نہیں
وہ ذکر تھا کسی بارش کی رات کا شاید
نظر میں آ کے تھمی تھی تمہاری بات نہیں

حسنین سحرؔ

آنکھوں تلک آتا رہا نم آپ ہی   ہم جرعہ جرعہ جام سے پیتے رہے

حسنین سحرؔ نے شاعری میں اپنے لیے ایک الگ جہان تخلیق کیا ہے۔ اس جہان میں زمینیں، آسمان، چاند، سورج اور ستارے اُن کے اپنے ہیں۔ ذات سے کائنات تک پھیلے ہوئے سوالوں سے مزین اُن کی شاعری قاری کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتی ہے۔ اُن کا تعلق شعراء کے اُس قبیلے سے ہے جو نمود و نمائش یا ذاتی منفعت کو پس پشت ڈال کر پوری توجہ اپنے فن پر مرکوز رکھتے ہیں۔ حسنین سحر کی غزل میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو اُن کا قد اپنے ہم عصر شعراء میں ممتاز کرتی ہیں۔

نہیں ہوتا اچھا زیادہ تر مجھے دیکھنا
کبھی لازمی ہو تو مختصر مجھے دیکھنا
میں نظر میں آ کے تری نظر ہی بدل نہ دوں
یہی مشورہ ہے کہ دیکھ کر مجھے دیکھنا
ابھی تک میں آٹھ پہر کا نکلا پھرا نہیں
مرے دوست اب کسی تو اپہر مجھے دیکھنا
یہ جو آج خانہء خود میں خوار و زبوں ہوں میں
کبھی ہو سکے تو پھر اپنے گھر مجھے دیکھنا
مجھے کیا پکارتا ہے جہاں مجھے کیا خبر
مرا اِسم ہے ترا اِک نظر مجھے دیکھنا
یہ ترے ہی طور پہ اپنے بچوں کو دیکھتا
میں وہی ہوں طفل مرے پدر مجھے دیکھنا
میں یہیں کا ہو گیا ہوں سحرؔ کوئی روک دے
سبھی خلق کا سرِ رہ گزر مجھے دیکھنا

فناؤں کا مکیں ہوں میں
مجھے دیکھو نہیں ہوں میں
مِٹا کیا کیا جتن کر کے
دوبارہ جا گزیں ہوں میں
ذرا سی نیند لے لو تم
یقیں رکھو یہیں ہوں میں
کہیں پاتال سے نیچے
کہیں عرشِ بریں ہوں میں
سراسر خاک آلودہ
فقیروں کی جبیں ہوں میں
یہی اِک وہم رہتا ہے
کہیں ہوں میں، کہیں ہوں میں
ابد تک دیکھ سکتا ہوں
ازل کا دُوربیں ہوں میں
سحرؔ ہم ایک ہیں دونوں
ترا ہی تو یقیں ہوں میں

کبھی خطر مول لے کے کوئی خطا بھی کی تھی!
کہو، پرستش کے باب میں انتہا بھی کی تھی!
نظارہ ہم ایسے نا سپاسوں سے پوچھتا ہے
کہ چشم یک بار، اے غرقِ دیدار، وا بھی کی تھی!
ہے ایک دُنیا، جو پیچھے خوار و زبوں ہے تیرے
اے روحِ مجنوں! نظر کبھی پشتِ پا بھی کی تھی!
سفر ہی پیشِ نظر رہا، یا تلاش بھی تھی
قدم بڑھاتے رہے، یا کوئی صدا بھی کی تھی!
سرہانے بیمار کے جو شب بھر کھڑا رہا ہے
اُسی سے پوچھا یہ جا رہا ہے، دُعا بھی کی تھی؟
نمائشِ جلوہ ہی نہیں حسن کی ضرورت
علاوہ بر عرضِ شوق، حمد و ثنا بھی کی تھی!
سحرؔ، ذرا پوچھیے دلِ درد آزما سے
فغاں ہی کرتا رہا سدا، التجا بھی کی تھی؟

چھاتا گیا ہر سو ترا غم آپ ہی
ہے سرنگوں اِس صبح پرچم آپ ہی
یہ سچ نہیں روتے رہے ہم رات بھر
آنکھوں تلک آتا رہا نم آپ ہی
ہم جرعہ جرعہ جام سے پیتے رہے
ہوتا رہا ضم خون میں سم آپ ہی
یہ رات کٹ جائے کہیں کاٹے بغیر
یہ لَو کہیں پڑ جائے مدھم آپ ہی
اِس سوچ میں گم بسترِ گل پر گرے
ارض و سما ہو جائیں برہم آپ ہی
کی جستجو تیرے بیانِ حسن کی
اور روح تک کھلتے گئے ہم آپ ہی
آسانیاں دُنیا میں دیں والی نہیں
ہوتے ہیں اس میں کام کم کم آپ ہی
ہے اِتمامِ آرزو شاید گناہ
تو کھینچ لیجے آخری دم آپ ہی

اشفاق ناصر / رحیم یار خاں

ہر محبت کے لیے دل میں الگ خانہ ہے
ہر محبت اُسی خانے میں گزر جاتی ہے

اشفاق ناصر جدید غزل کے نہایت معتبر شاعر ہیں۔ اُن کی غزل عصرِ حاضر کی نمائندہ غزل ہے۔ اُن کے بہت سے شعر نوجوان نسل میں مقبول ہیں۔ اُن کی غزل کی انفرادیت، شگفتگی، سلیقگی اور نیا پن اُنھیں ہم عصر شعراء سے ممتاز کرتا ہے۔ اشفاق ناصر کی شاعری کے موضوعات اچھوتے ہی نہیں دل پذیر بھی ہیں۔ اُن کا شمار اُن شعراء میں ہوتا ہے جو کسی مفاد یا منفعت کے لیے شعر نہیں کہتے بلکہ شاعری خود رو پودوں کی طرح اُن کے اندر جڑ پکڑتی ہے۔ اشفاق ناصر غزل سے مہکا ہوا شاعر ہے اس لیے اُس کی شاعری پڑھ کر بھرپور تازگی کا احساس ہوتا ہے۔

اگر خوشی میں تجھے گنگنانے لگتے ہیں
تو لوگ شہر کے آنسو بہانے لگتے ہیں
نکل کے آنکھ سے لفظوں میں آنے لگتے ہیں
میاں! یہ اشک ہیں یونہی ٹھکانے لگتے ہیں
گزر چکے ہیں کسی عکس کی معیت میں
ہم ایسے لوگ جو آئینہ خانے لگتے ہیں
شجر ہوں اور پرندوں سے ہے بہار مری
یہ مجھ پہ آئیں تو پھل پھول آنے لگتے ہیں
تو کرنے لگتے ہیں غسلِ تلاشِ مصرعِ نو
ہم اپنے آپ کو جب بھی پُرانے لگتے ہیں
بغور دیکھیں تو یک جست فاصلے پہ ہے تو
لگانا چاہیں تو صدیاں زمانے لگتے ہیں
ہم آئینے میں ترا عکس دیکھنے کے لیئے
کئی چراغ ندی میں بہانے لگتے ہیں
میں جن کو دیکھ کے آیا ہوں منتظر اشفاق
وہ لوگ، لوگ نہیں ہیں، فسانے لگتے ہے

عکس کو پھول بنانے میں گزر جاتی ہے
زندگی آئنہ خانے میں گزر جاتی ہے
شام ہوتی ہے تو لگتا ہے ' کوئی روٹھ گیا
اور شب اُس کو منانے میں گزر جاتی ہے

ہر محبت کے لیے دل میں الگ خانہ ہے
ہر محبت اسی خانے میں گزر جاتی ہے
زندگی بوجھ بتاتا تھا بتانے والا
یہ تو بس ایک بہانے میں گزر جاتی ہے
تو بتا ' آنکھ نیا خواب کہاں سے دیکھے!
روز شب تجھ کو بھلانے میں گزر جاتی ہے
جو گھڑی رکھتے ہیں اظہارِ محبت کے لیے
وہ گھڑی بات بنانے میں گزر جاتی ہے
وہ چلا جاتا ہے اور ساعتِ رُخصت اشفاق
جسم کا بوجھ اُٹھانے میں گزر جاتی ہے

یاد رکھے گا مرا کون فسانہ مرے دوست
میں نہ مجنوں ہوں ' نہ مجنوں کا زمانہ مرے دوست
ہجر انساں کے خدوخال بدل دیتا ہے
کبھی فرصت میں مجھے دیکھنے آنا مرے دوست
شام ڈھلنے سے فقط شام نہیں ڈھلتی ہے
عمر ڈھل جاتی ہے ' جلدی پلٹ آنا مرے دوست
اے مرے دوست ! سبھی دوست تجھے جانتے ہیں
تیرا پوچھیں گے کبھی دوست ٹھکانہ ' مرے دوست
روز کچھ لوگ مرے شہر میں مر جاتے ہیں
عین ممکن ہے ٹھہر کر چلے جانا ' مرے دوست
تم اگر اب بھی کھنڈر دیکھ کے خوش ہوتے ہو
تو کسی دن مری جانب نکل آنا مرے دوست
جیسے مٹی کو ہوا ساتھ لیے پھرتی ہے
میں کہاں اور کہاں میرا ٹھکانہ مرے دوست
مجھ کو بتلانا ' محبت کو گنوا کر ' اشفاق
ہاتھ لگ جائے اگر کوئی خزانہ مرے دوست

روشنی سی جو مرے خواب میں آئی ہوئی ہے
منظرِ ہجر نے قندیل جلائی ہوئی ہے
ایک کاسہ تھا ' جسے توڑ دیا ہے میں نے
اک چٹائی ہے جو صحرا میں بچھائی ہوئی ہے
آنکھ میں جلتے چراغوں کا سبب پوچھتے ہو!
میرے سینے میں کوئی شام سمائی ہوئی ہے
ٹھیک ہے ' بس تو گئی ہے تری دُنیا ' لیکن
آسمانوں کی زمینوں سے جدائی ہوئی ہے؟
روز و شب ہجر کی محنت کا صلہ ہے ترا خواب
چشمِ گریہ ! یہ اثاثہ ' یہ کمائی ہوئی ہے
اب کہیں جا کے مجھے عشق ہُوا ہے اشفاق
اب کہیں جا کے مری خود سے رہائی ہوئی ہے

سیّد مقبول حسین / راولپنڈی

میں ترے آئنے میں شکل نئی لایا ہوں　　اب محبت سے مری سمت بڑھا ہاتھ اپنے

کرنل سیّد مقبول حسین کی تخلیقی فعالیت کے یوں تو متعدد رنگ وروپ ہیں مگر ان کی غزل ان کی شعری شناخت کا سب سے مؤثر ذریعہ اظہار ہے۔ غزل اب ان کے زیرِنظر پانچویں شعری مجموعے کا امتیاز بن کر ہم سے ایک بار پھر داد طلب ہے۔ ان کے اس تازہ کار شعری مجموعہ میں اسلوب، موضوع اور فکری رویے میں شعر کے اعتبار سے ہمیں ایک مختلف نوع کی انفرادیت ملتی ہے وہ ان کا غزل کے عمومی اور مستحسن موضوعات سے ذرا اُوپر اُٹھ کر بات کرنا ہے۔ قبل ازیں ان کے اشاعت پذیر مجموعوں میں محبت اور معاملاتِ محبت سے ان کا فطری سلوک جتنا بے باکانہ تھا اتنا ہی زیرِنظر شعری تصنیف میں صوفیانہ طرزِ احساس اور تصوف کی زندگی سے ان کا فکری برتاؤ بے تکلفانہ ہے۔ گویا یہ ان کے رنگِ شاعری میں ایک نئے رنگ کا اضافہ ہے۔ ان کی اس نوع کے طرزِ احساس ک سحر سے غزلوں میں خیال کے تسلسل کی ایک پر کیف رو چلتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ اس میں خود سپردگی میں ڈوبی ہوئی ایک سچے عاشق صادق کی ہستی اور حال جمال میں رچی ہوئی مستی عجیب کیفیت میں دھمال ڈالتی سنائی دیتی ہے۔ ایسا دھمال جو صوفیانہ ماحول اور تشخص کی پہچان ہے۔ (ڈاکٹر نثار ترابی)

میں تجھے ڈھونڈ جو سوئے فلک آیا ہوں
دھوپ میں اُڑتے پرندے کا کوئی سایہ ہوں
تم تو اپنے ہی درِ خاک میں گم بیٹھے ہو
میں سرِ شام یہ کس شخص کو لے آیا ہوں
تجھ میں ہمت ہے تو پھر ڈال کوئی عکس جمال
میں ترے آئنے میں شکل نئی لایا ہوں
اب محبت سے مری سمت بڑھا ہاتھ اپنے
بے وفا ترے لیے اپنی وفا لایا ہوں
میں تو خود چھاؤں کی صورت ہوں یہاں پر مقبولؔ
کون کہتا ہے کہ میں دُھوپ سے گھبرایا ہوں

گردشیں

جہاں کی گردشیں ہیں اور تیرہ بخت ہیں سائیں
ستاروں کی روش میں بس گئی ہے زندگی اپنی
مقدر کی غزل کے شعر سب دولخت ہیں سائیں
کسی کے ذہن و دل میں اُلفتیں گھر کر گئی ہوں گی
ہوائیں اپنی بے دم آہٹوں سے ڈر گئی ہوں گی

ادھر جلوت اکائی کی طرح پابند نظارہ
ادھر ہے فرشِ خلوت دور تک پھیلا ہوا سائیں
یہ دامن اُلجھنوں کی گرد سے میلا ہوا سائیں
ہمارا دل چراغ و نور کی چکی میں پستا ہے
ظروفِ کرب سے ماتم کا آبِ خشک رِستا ہے
ہم ایسی فصلِ گل جو قحط سالی سے عبارت ہے
ہماری زندگی بے کار ہے بالکل اکارت ہے

معجزہ ایک خواب میں دیکھا
عکس اِک ماہتاب میں دیکھا
لہر ملتی ہے آب میں کیسے
اِک تماشا سا خواب میں دیکھا
ایک نشہ دھمال میں ہے اب
رقص جب سے حباب میں دیکھا
وہ بھی کیسا عجیب منظر تھا
سوکھا پتہ بھی تاب میں دیکھا

رات چوکھٹ پہ نیند کا پہر
میں بھی تنہا ہوں خواب میں دیکھا
رقص تھا سرد راکھ پر مقبولؔ
رنگ پھیکا گلاب میں دیکھا

زندگی شام سی گھٹتی جائے
کوئی خیرات ہے بٹتی جائے
جسم ہیں فانی سومٹ جائیں گے
روح کیوں ان میں سمٹتی جائے
اب تو وہ رات ہے میرے دل میں
صبح بھی جس سے کہ ہٹتی جائے
سوچ کی لہریں رواں رہنے سے
دُھوپ سی ذہن سے چھٹتی جائے
اب تو یہ حال ہوا ہے مقبولؔ
زندگی سانس سے کٹتی جائے

قیصر مسعود / دوحہ

اس شہر میں چلنا بھی اب ایسے ہے کہ جیسے
اُجڑے ہوئے خاموش خرابات میں چلنا

قیصر مسعود اگر چہ دیارِ غیر میں مقیم ہیں لیکن ان کی شاعری سے وطن کی مٹی کی خوشبو آتی ہے۔ وہ اپنی ماضی کی یادوں سے اپنی غزل تشکیل دیتے ہیں۔ مزاجاً بہت کم گو، نرم گفتار اور صلح جو ہیں۔ اسی لیے اُن کی شخصیت کے عکس اُن کی شاعری میں بھی جھلکتے ہیں۔ وہ اپنی ذات کی تسکین کے لیے شعر کہتے ہیں۔ آج کل کے شعراء کی طرح نہ تو اُنہیں ناقدریٔ زمانہ کا گلہ ہے اور نہ باکمال شاعر ہونے کا دعویٰ۔ وہ غزل کے اُن تمام رموز سے واقف ہیں جس سے غزل، غزل بن جاتی ہے۔

غزل کہنے کا ہم کوئی بہانہ ڈھونڈ لاتے ہیں
چلو پہلی محبت کا زمانہ ڈھونڈ لاتے ہیں
ہزاروں صورتوں کی بھیڑ میں ہم لوگ چپکے سے
کوئی خوش خط سا چہرہ شاعرانہ ڈھونڈ لاتے ہیں
ہم اکثر کھو بھی جاتے ہیں یونہی بے سمت رستوں میں
مگر ہر موڑ پر اپنا ٹھکانہ ڈھونڈ لاتے ہیں
اگر چہ ہم بھی ہیں خانہ بدوشوں کے قبیلے سے
مگر تیرے لیے اک آشیانہ ڈھونڈ لاتے ہیں
جہاں میں ہر طرف پھیلی ہزاروں داستانیں ہیں
ہم ان سے اک محبت کا فسانہ ڈھونڈ لاتے ہیں
ہم اپنے دشمنوں میں صلح جو مشہور ہیں قیصر
کسی بھی طور ان میں دوستانہ ڈھونڈ لاتے ہیں

کیا ملے گا اچھال کر پتھر
پاس رکھو سنبھال کر پتھر
آؤ پھر سے محبتیں کر لیں
اپنے دل سے نکال کر پتھر
ماں نے میری شکم تسلی کو
گھر میں رکھے ابال کر پتھر
کوئی تجھ سے مراد کیا مانگے
تو ہی سب سے سوال کر پتھر
سر بسر ہیں جو آئینہ صورت
کچھ تو ان کا خیال کر پتھر
بت کدوں کی بھی لاج رہ جائے
کوئی ایسا کمال کر پتھر
کتنے انسان سو گئے قیصر
اپنے جسموں پہ ڈال کر پتھر

ہر آن اسی صورت حالات میں چلنا
دن رات فقط اس کے خیالات میں چلنا
اس شہر میں چلنا بھی اب ایسے ہے کہ جیسے
اُجڑے ہوئے خاموش خرابات میں چلنا
بھٹکا ہوں کئی بار میں عجلت کے سفر میں
بہتر نہیں اب شدت جذبات میں چلنا
ہر شام کسی بچھڑے ہوئے شخص کو رونا
ہر رات کسی یاد کی برسات میں چلنا
رفتار زمانے کی بہت تیز ہے قیصر
اچھا ہے فقط اپنی ہی اوقات میں چلنا

درد جزو بدن بنا ہی نہیں
شعر مجھ سے ابھی ہوا ہی نہیں
کیسے نوحے کہاں کی آہ و بکا
دل میں نشتر کوئی چبھا ہی نہیں
چل پڑے ہیں فراق کے جھکڑ
خیمۂ وصل ابھی تنا ہی نہیں
وہ بھی نیندیں اجاڑ دیتا ہے
ہجر جس کا میں کاٹتا ہی نہیں
روز کرتا ہوں انتظار اس کا
جس کو رخصت کبھی کیا ہی نہیں
ہم ہیں اس سانحے پہ نوحہ کناں
رونما جو ابھی ہوا ہی نہیں
اس دیے کو بھی رو لیا جائے
وہ دیا جو ابھی بجھا ہی نہیں

نہ کوئی رنگ نہ شوخی نہ ادا میرے بعد
ہائے اس شخص کا کیا حال ہوا میرے بعد
بعد میرے وہ کبھی گھر سے نہ باہر نکلا
اس کو آتی ہے زمانے سے حیا میرے بعد
میں بلاتا تھا تو آ جاتا تھا گاہے گاہے
وہ مرے شہر میں آیا نہ گیا میرے بعد
اس کی آنکھوں میں مرا عکس اتر آتا تھا
اسی خاطر وہ کسی سے نہ ملا میرے بعد
وہ مرے ساتھ تھا تو پردہ نشیں تھا کتنا
لگ گئی اس کو زمانے کی ہوا میرے بعد
میں اگر دست مسیحائی سے محروم رہا
اس نے بھی درد سے پائی نہ شفا میرے بعد
سانس لینا اسے دشوار بہت تھا لیکن
اپنے حصے کے کئی سال جیا میرے بعد
وہ یہی بات کیا کرتا تھا قیصر مجھ سے
بھول جانا نہ کہیں میری وفا میرے بعد

ارشد نذیر ساحلؔ/

اک تو تھا کہ ہمیں تیرا بھرم رکھنا پڑا   ورنہ ہم لوگ کسی اور سے ہارے کب تھے

ارشد نذیر کی شاعری نوجوان جذبوں اور اُمنگوں کی ترجمان ہے۔ وہ اپنے اردگرد ایک ایسی فضا کے متلاشی ہیں جہاں امن اور محبت کا سکہ چلتا ہو۔ ارشد نذیر ساحل کی ذات متجسس ہے۔ اس لیے وہ اپنی شاعری میں تلاش کے سفر پر نکلتے ہیں تو غزل کی طرح خود بھی سراپا سوال بن جاتے ہیں۔ بے ساختہ پن جو کہ شعری اظہار کا طرۂ امتیاز ہے اُن کی شاعری میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ شعر کو شعر بنانا ہی اصل ہنر ہے اور یہ ہنر ارشد نذیر ساحل کو خوب آتا ہے۔

کوئی بتائے، چاند ستارے کہاں گئے
اس چشم پُرفریب کے مارے کہاں گئے
ویران شام، دل بھی ہے ہر آن بےقرار
ایسے میں میرے راج دُلارے کہاں گئے
سیلاب اشک خستہ دلی، بے قرار رُوح
اس عالم شباب کے دھارے کہاں گئے
طوفاں کی زد میں آ کے سمندر کو چپ لگی
لہروں کی دیکھا دیکھی کنارے کہاں گئے
سینے سے ہوک اُٹھتی تھی موجِ انا کے ساتھ
پھولیں جو تلخ سانسیں سہارے کہاں گئے
پت جھڑ کی سلطنت نے تو ویرانیاں ہی دیں
ساحلؔ وہ ہم سفر تمہارے کہاں گئے

عیار و مکار بہت ہے
دُنیا دار بہت ہے
تو کیا دل کے تڑپانے کو
روزانہ اخبار بہت ہے
اس سے انا کی بات نہ کرنا
وہ ظالم خوددار بہت ہے
دل کا آنگن بٹ جانے کو
لفظوں کی دیوار بہت ہے
جنگل کی تسکین کی خاطر
بستی کا کردار بہت ہے

انسانی قدروں کی دُلہن
صدیوں سے بیمار بہت ہے
پاگل من کے بہلانے کو
سینوں کا سنسار بہت ہے
ساحلؔ دل کو سمجھا دیکھا
یہ ظالم ہشیار بہت ہے

ادھورے رہ گئے جو ان ارمانوں کا کیا ہوگا
حقیقت سے جو عاری ہیں ان افسانوں کا کیا ہوگا
جو جل کر ہو گئے کشتہ، وہی تو سرخرو ٹھہرے
مگر جو بچ گئے ہیں ایسے پروانوں کا کیا ہوگا
اگر توحید کے قائل سبھی ہو جائیں دُنیا میں
میں اکثر سوچتا ہوں پھر صنم خانوں کا کیا ہوگا
بس اتنا سوچ لے پہلے درختوں کو جو کاٹے ہے
پرندوں کے بسیروں اور کاشانوں کا کیا ہوگا
اگر ساحلؔ یہ خاموشی ہمیشہ ہی رہے طاری
ہوائیں تند نہ ہوں گی تو طوفانوں کا کیا ہوگا

تیری یادوں نے ہی روکا ہے جدھر سے گزرے
تیرا دیوانہ کہاں جائے کدھر سے گزرے
بیٹھے رہتے ہیں تری راہ میں اکثر تنہا
اسی اُمید پہ شاید تو ادھر سے گزرے
بھیجتا رہتا ہوں اخباروں میں اکثر اشعار
کوئی تو شعر میرا تیری نظر سے گزرے
میرے غم کو نہ کبھی دل میں جگہ تم دینا
دھیان تیرا نہ کہیں دیدۂ تر سے گزرے
آئے گا دیکھنے اِک روز کبھی ساحلؔ کو
کتنے موجوں کے تھپیڑے جو ادھر سے گزرے

ہم نے دو پل بھی کبھی ساتھ گزارے کب تھے
اِک گماں سا تھا فقط آپ ہمارے کب تھے
اک تو تھا کہ ہمیں تیرا بھرم رکھنا پڑا
ورنہ ہم لوگ کسی اور سے ہارے کب تھے
یہ بجا ہے کہ ادھر آ کے نہ کچھ ہاتھ آیا
اس طرف بھی میری قسمت میں ستارے کب تھے
یہ نصیبا تو مرے گاؤں کے لوگوں ہی کا تھا
شہر میں تیرے بھلا ہجر کے مارے کب تھے
کتنے لوگوں سے تھا دن رات تعلق اپنا
ساتھ رہتے تھے مگر یار وہ سارے کب تھے
چارہ گر جس کو سمجھتے تھے ہمیں چھوڑ گیا
ساحلؔ اس دل کو زمانے کے سہارے کب تھے

اقبال طارق/ بحرین

کون پرایا بوجھ اُٹھاتا ہے طارق   خود ہی اپنی لاش اُٹھانی پڑتی ہے

اقبال طارق طویل عرصہ سے بحرین میں مقیم ہیں۔ دیارِ غیر میں رہ کر شعروادب سے منسلک رہنا اُن کی ادب سے کمٹ منٹ کو ظاہر کرتا ہے۔ وہ بحرین اور پاکستان کے حلقوں میں یکساں مقبول ہیں۔ اُن کی غزلیں اپنے منفرد اسلوب اور سادگی کے باعث قاری کے دل میں اُتر جاتی ہیں۔ اُن کی شاعری غم دوراں اور غم جاناں کا حسین امتزاج ہے۔ اقبال طارق شعر کہنے کے لیے کسی مشکل میں نہیں پڑتے اور نہ ہی قاری کو کسی مشکل میں ڈالتے ہیں۔ بلکہ سیدھا، سادہ اور آسان شعر کہتے ہیں جو متاثر کرتا ہے۔

دل میں دُکھ کی آگ لگانی پڑتی ہے
جس سے اپنی ذات بچانی پڑتی ہے
جب سوچوں کا سورج سر پر نہ آئے تو
ہر دُکھ کی زنجیر ہلانی پڑتی ہے
ماضی کی گلیاں ہم چھانا کرتے ہیں
رستے میں بھرپور جوانی پڑتی ہے
من کے اندر دُکھ کے میلے لگتے ہیں
خوشیوں پر تو گھات لگانی پڑتی ہے
بستی میں جب قندیلیں سی جلتی ہیں
تو اپنی ہی شام منانی پڑتی ہے
ہر قیمت پر جب منزل کو پانا ہو
رہ کی ہر دیوار گرانی پڑتی ہے
ہجر کی لمبی رات بتانے کی خاطر
کیسی کیسی بات بنانی پڑتی ہے
کون پرایا بوجھ اُٹھاتا ہے طارق
خود ہی اپنی لاش اُٹھانی پڑتی ہے

چلو ہم اپنا یہ لہجہ بدل کے دیکھتے ہیں
اب اُس کے رُوپ میں کچھ دیر ڈھل کے دیکھتے ہیں
ابھی تو محوِ سفر دشتِ ہجر میں ہیں ہم
اور اپنی راہ وہاں لوگ تھل کے دیکھتے ہیں

تمام عمر جلے اور نہ بن سکے کندن
تو ہجر یار میں کچھ اور جل کے دیکھتے ہیں
جو لوگ نوکِ سناں پر اُچھالتے تھے ہمیں
وہ لوگ آج ہمیں ہاتھ مل کے دیکھتے ہیں
اُفق پہ پھیلی شفق تو پیامِ سحری ہے
چراغِ شب جسے پہلو بدل کے دیکھتے ہیں
سکونِ قلب و نظر مجھ سے چھین لینے کو
کبھی کبھی میرے ارماں مچل کے دیکھتے ہیں
جو سچ کی تاب نہ رکھتے ہوں اُن کی فطرت ہے
کہ آئنے میں وہ خود کو سنبھل کے دیکھتے ہیں
جنہیں نظر نہیں آتے خود اپنی ذات کے عیب
وہ عیب کیسے ہماری غزل کے دیکھتے ہیں
ہمیں خبر ہے فریب اُس کی دوستی ہے مگر
ذرا سی دیر سہی ساتھ چل کے دیکھتے ہیں
یہ عزم ہم کو سکھایا ہے وقت نے طارق
شبِ فراق ہے اور خواب کل کے دیکھتے ہیں

لوگ جو دستِ ہنر رکھتے ہیں
اُن کے لہجے بھی اثر رکھتے ہیں
دشتِ بے نام مسافر تیرے
دل میں کب خوف و خطر رکھتے ہیں

طور جلتے ہیں کئی سینے میں
آنکھ میں خواب نگر رکھتے ہیں
ایک پہلو میں ہے تاریکی سی
ایک پہلو میں سحر رکھتے ہیں
شوقِ پرواز میں مر جائیں گے
وہ جو ٹوٹے ہوئے پر رکھتے ہیں
ہم تو اربابِ وفا ہیں طارق
ہم تو ہیرے کا جگر رکھتے ہیں

کبھی گلاب کی خوشبو کبھی چنبیلی سوچ
کبھی ہ جان کی دشمن کبھی سہیلی سوچ
پھر آج مجھ پہ صحیفہ خیال کا اُترا
دھنک کے رنگ غزل میں نئی نویلی سوچ
تمام عمر میں اُلجھا رہا مگر پھر بھی
اُسے میں بوجھ نہ پایا عجب پہیلی سوچ
رہیں گے ہم بھی بچھڑ کر اُداس اور تنہا
رہے گی تو بھی ہمارے بنا اکیلی سوچ
تمہارے دل میں نہ آسیب درد بس جائے
اُجاڑ کر میرے دل کی کہیں حویلی سوچ
مرے لیے تو یہی ہے سرورِ جاں طارق
مرے حواس پہ حاوی ہے میری بیلی سوچ

احمد عطاء اللہ / آزاد کشمیر

پہلے دل کی پڑی ہوئی تھی ہمیں — اور اب جان کی پڑی ہوئی ہے

احمد عطاء اللہ ان معدودے چند شعراء میں سے ہے جس کا اس غولِ بیابانی کے درمیان موجود ہونا غنیمت ہی نہیں باعث حیرت بھی ہے۔ یہ شعر کو شعر بنا دینے کا فن جانتا ہے۔ نیز غالب کی طرح یہ کیفیت کا نہیں بلکہ مضمون کا شاعر ہے۔ یہ اپنی شاعری سے ثابت کرتا ہے کہ نئے مضامین کے اس قحط میں بھی نئے مضمون کی چنگاری چھوڑی جا سکتی ہے۔ جس شاعر کی اُٹھان ایسی ہو اس کی اُڑان کا اندازہ لگانا کچھ ایسا مشکل نہیں۔ عمدہ شاعری بہر حال کسی کی جاگیر یا اجارہ نہیں ہے۔ میری عمر ہی تھوڑی رہ گئی ہے ورنہ میں اسے اپنی عمر بھی لگنے کی دُعا ضرور دیتا۔ یہ مجموعہ میرے لیے بھی ایک چیلنج تھا اور آپ کے لیے بھی ہے۔ (ظفر اقبال)

یک طرفہ محبت تھی جتانی بھی نہیں تھی
جا جا کے کتھا سب کو سنانی بھی نہیں تھی

میں ڈھونڈ نے نکلا تھا بھرے شہر میں جس کو
اُس کی تو کوئی خاص نشانی بھی نہیں تھی

اوہام بھرے شہر میں دُشوار تھا ملنا
اور ہم نے تو منت کوئی مانی بھی نہیں تھی

لوگوں میں تھی رائج ابھی تحفوں کی روایت
شہروں میں ابھی اتنی گرانی بھی نہیں تھی

چاہا تھا کہ لے جاؤں ہتھیلی پہ دل و جاں
یہ رسم کوئی اتنی پرانی بھی نہیں تھی

پہنچا میں سرائے میں تو بجھتا تھا الاؤ
اور پاس مرے کوئی کہانی بھی نہیں تھی

اُس خاک کے ذرّے مری پلکوں پہ جڑے تھے
وہ خاک جو میں نے ابھی چھانی بھی نہیں تھی

وہ پہلی محبت تھی عطاؔ پہلی محبت
اور راس ہمیں دوسری آنی بھی نہیں تھی

اے عشق تو اکیلے میں ڈر تو نہیں گیا
میں سانس لے رہا ہوں میں مر تو نہیں گیا

کیوں روشنائی اُڑنے لگی ہے خطوط کی
تو اپنی دوستی سے مکر تو نہیں گیا

اِک پھول کھلنے والا تھا چشمے کے آس پاس
خواہش کی آندھیوں میں بکھر تو نہیں گیا

چلتے ہوئے بھی رکھتا ہے نظریں زمین پر
اے دل تو آسمان سے بھر تو نہیں گیا

اِک زرد پیڑ نے کئی لوگوں سے یہ کہا
کیا موسم بہار گزر تو نہیں گیا

آوارگانِ شہر سنو، چاند کی طرح
رستہ بدل لیا ہے، میں گھر تو نہیں گیا

گھر میں بس شاعری پڑی ہوئی ہے
اور یہ زندگی پڑی ہوئی ہے

پہلے دل کی پڑی ہوئی تھی ہمیں
اور اب جان کی پڑی ہوئی ہے

واپسی کے ہیں راستے دُھندلے
آنکھ میں دوستی پڑی ہوئی ہے

کل جو تم تھے تو ہم بھی زندہ تھے
آج تو موت سی پڑی ہوئی ہے

اپنی اپنی پڑی ہے سب کو یہاں
اور ہمیں آپ کی پڑی ہوئی ہے

کچھ تو یہ صبح لائی ہے اُمید
اور کچھ رات کی پڑی ہوئی ہے

گلی کا عام سا چہرہ بھی پیارا ہونے لگتا ہے
محبت میں تو ذرّہ بھی ستارا ہونے لگتا ہے

یہاں گم سم سے لوگوں پر کبھی پلکیں نہیں اُٹھتیں
اشارا کرنے والوں کو اشارا ہونے لگتا ہے

ہماری زندگی پر ہے ہمارے عشق کا سایہ
کہ ہم جو کام کرتے ہیں خسارا ہونے لگتا ہے

محبت کی عدالت بھی بھلا کیسی عدالت ہے
کہ جب بھی اُٹھنے لگتے ہیں پکارا ہونے لگتا ہے

زمین و آسماں کے سارے صحرا رقص کرتے ہیں
کسی پر عشق جب بھی آشکارا ہونے لگتا ہے

عطاؔ بے صبر لوگوں کے کبھی برتن نہیں بھرتے
گزارا کرنے والوں کا گزارا ہونے لگتا ہے

انہی میلے کچیلے سے انہی ناکام لوگوں میں
عطاؔ سچی خوشی دیکھی ہے میں نے عام لوگوں میں

خدا کے برگزیدہ ہیں، ہمارا مرتبہ یہ ہے
ہماری صبح لوگوں میں، ہماری شام لوگوں میں

جہاں آواز جاتی ہے وہاں تک فرض ہے میرا
اب اس سے آگے لے جائے ہوا پیغام لوگوں میں

حویلی سے کہیں باہر مجھے سڑکوں پہ مرنا ہے
خدا کا شکر لکھا ہے مرا انجام لوگوں میں

کئی پرہیز گاروں کے تعاقب سے عطاؔ بچ کر
بڑی مشکل سے پہنچا ہوں میں ان بدنام لوگوں میں

یامین/ آزاد کشمیر

یامین کی نظموں کی نامیاتی وحدت کچھ اس طرح جذبہ، خیال، کانسپٹ، استعاراتی نظام اور اسلوب کی مختلف النوع اور مختلف الصوت اکائیوں کو کمپوز کرتی ہے کہ اس پر ایک میلوڈی کا گمان ہوتا ہے۔ یہ مربوط بھی ہے، کیف آور بھی ہے اور بامعنی بھی۔ مجھے اُمید ہے کہ یامین کی نظموں کو اُردو کی نئی نظم کی Slim Corpus میں ایک سود منداضافہ قرار دیا جائے گا۔ (ستیہ پال آنند، ڈاکٹر/امریکہ)

کلام

دن تو سارا
رٹے رٹائے جملے بولتے رَٹ جاتا
رات آتی تو
راج محل کے چڑیا گھر میں
دیس بہ دیس کے توتے
اپنے اپنے کنج قفس میں
لال کھجوروں کا بغداد
اور مہکتے سیبوں کا کشمیر جگا کر سوتے
اپنے پھولوں
اور باغوں کی یاد میں
چھپ کر روتے

روتے تھے ان وقتوں کو
جب سارے میں خیریت تھی
سارے سرخ و سبز اچھے تھے
جب یہ اپنے (باغوں والے) ہم جنسوں
پر
رعب جما کر کہتے
اس پنجرے میں
کیسی کیسی باتیں ہم نے سیکھیں
تو تاچشمی جیسا فن ایجاد کیا
اور مہذب قوم کی دل کش بولی سیکھی
اب بولے کے اچھر جب سے بول رہے
ہیں
اپنی یہ تلوار زباں رُکتی ہی نہیں
ان پھر پھر گھومتی آنکھوں نے کیا دیکھ لیا
اب یہ نظر تو
اور کہیں ٹکتی ہی نہیں
پنجرے کی دُنیا کے سوا
کوئی اور جگہ دِکھتی ہی نہیں
ان میں سے کچھ
دھیمی دھیمی ٹیں ٹیں کرتے
اور یہ باتیں سن کر ہنستے
کہتے......
ان نادانوں نے
آخراب تک کیا بولا ہے
ایک میاں مٹھو کے سوا
ان پھر پھر گھومتی آنکھوں نے
آخراب تک کیا دیکھا ہے
اپنے ہی آنسو کے سوا

پنجرے کے ظلمات میں بیٹھا
اِک ہریالا بول رہا ہے
آج مجھے
بصرے کی میٹھی لال کھجور کا
تحفہ کون کھلائے
مٹی تیل سے چڑیا گھر کی
بتی کون جلائے

ستارے کو ستارے کی خبر ہے

اسد سنبلہ کے پیچھے ہے
شکاری شیر کے آگے کھڑا ہے
یہ چار آنکھیں
یہ دو چہرے
برابر آ گئے تو
حادثہ شاید
کسی تقویم سے بھی
ٹل نہیں سکتا

جاوید رضی/ لاہور

میں نے مانگی ہے تم سے آج کی شام
بات کو کل پہ ٹال مت دینا

جاوید رضیؔ جدید لب و لہجے کے خوبصورت شاعر ہیں۔ اُن کی شاعری سادہ اور سچے جذبوں کی ترجمان ہے۔ محبت ہو یا نفرت اظہار میں اُن کا بے ساختہ پن شعر کے حسن میں اضافہ کرتا ہے۔ 2003ء میں اُن کا پہلا شعری مجموعہ ''کہیں سے آ جاؤ'' شائع ہوا جسے ادبی اور عوامی حلقوں میں کافی پذیرائی ملی۔ اُن کا کلام اکثر بیشتر ادبی رسائل و اخبارات میں شائع ہوتا رہتا ہے۔ شاعری میں عابد حسین عابدؔ کو اپنا اُستاد مانتے ہیں۔

ہمارے ذہن میں اِک ڈر مکمل
بنا لیتا ہے اکثر گھر مکمل
میں شیشہ ہوں بھلا پھر کیا کروں گا
اگر وہ بن گیا پتھر مکمل
فلک بوسی کی عادت ہو گئی ہے
خدارا کر دے میرے پر مکمل
جدا گر ہو گئے تو کیا کریں گے
ہمارے راستے ہو کر مکمل
محبت سرخرو اس وقت ٹھہری
ہمارا کٹ گیا جب سر مکمل

اب کسی کی مثال مت دینا
مجھ کو دل سے نکال مت دینا
ہجر دینا بس ایک پل کے لیے
صورتِ ماہ و سال مت دینا
ہم ترے سامنے ہیں زندہ ہیں
ہم کو قصے میں ڈھال مت دینا
میں نے مانگی ہے تم سے آج کی شام
بات کو کل پہ ٹال مت دینا

تو مجھے اس طرح بلاتا ہے
جس طرح کوئی آزماتا ہے

روز ہی خواہشوں کے آنگن میں
اِک نیا خواب ٹوٹ جاتا ہے
میں اُسے روز بھول جاتا ہوں
وہ مجھے روز یاد آتا ہے
خامشی خود ہی بول پڑتی ہے
جب کبھی درد گنگناتا ہے
اب تجھے کس طرح بتائیں ہم
حوصلہ کس طرح سے آتا ہے

مری جاں بس یہ حیرانی بہت ہے
ذرہ سی آنکھ میں پانی بہت ہے
تمہی نے ساتھ چھوڑا تھا ہمارا
تمہیں آنے میں آسانی بہت ہے
ہمیں یہ زندگی الزام مت دے
کہ ہم نے اس کی تو مانی بہت ہے
محبت کے سوا اب اور کیا ہو
یہی ہم کو پریشانی بہت ہے
سبھی چہرے ترے جیسے لگے ہیں
تری آواز پہچانی بہت ہے
میں اب تک ہو نہیں پایا کسی کا
تری یادوں کی نگرانی بہت ہے

تم سے اُلفت ہی جب نہیں ہوگی
زندگی مضطرب نہیں ہوگی
کس سہولت سے اس نے کہہ ڈالا
مجھ کو اس کی طلب نہیں ہوگی
سو یہی سوچتا ہوں میں اکثر
یہ طلب مجھ کو کب نہیں ہوگی
چاند نکلے گا تیرے آنے سے
روشنی بے سبب نہیں ہوگی
زندگی اور کیا گزاریں گے
تو مری جان جب نہیں ہوگی

اتنا خاموش اب کہاں ہوں میں
اپنے اندر کہیں رواں ہوں میں
تو مجھے یاد کیا دلاتا ہے
مجھ کو معلوم ہے کہاں ہوں میں
اس قدر خود میں بھی نہیں موجود
جس قدر تیرے درمیاں ہوں میں
تو نے سوچا نہیں کہ کس حد تک
تیری سوچوں کا ترجماں ہوں میں
میری پہچان مجھ کو دے جانا
دھول ہوں یا کوئی دھواں ہوں میں

شازیہ نورین/اٹلی

مجھے یہ گردشِ ایام کس منزل پہ لے آئی — میں تنہا اِک طرف اور اِک طرف ساری خدائی ہے

شازیہ نورین میرے لیے نئی شاعرہ ہے کیونکہ اس سے پہلے اس کا کلام میری نظروں سے نہیں گزرا تھا۔ اب اگرچہ وہ میرے لیے نئی نہیں ہے لیکن میری خواہش ہے کہ آئندہ جب کبھی اس کا کلام میری نظروں سے گزرے اس میں وہی بے ساختہ پن اور مٹی کی وہی سوندھی سوندھی خوشبو ہو جو بارش کے پہلے قطرے کے بعد فضا کو معطر بناتی ہے۔ انسان جب رجسٹرڈ قسم کا شاعر بن جاتا ہے تو عموماً اس تازہ کاری سے محروم ہو جاتا ہے جو نئے لوگوں کو قدرت کی طرف سے ودیعت ہوئی ہوتی ہے۔ میں شازیہ کی ہر تخلیق کو اس کی پہلی تخلیق ایسا ہی دیکھنا چاہتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ ہر شاعر کی طرح اس کے اندر بھی ایک مکینک موجود ہے جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ خیال کو مزید بناتا اور سنوارتا چلا جائے گا۔ (عطاء الحق قاسمی)

ہوئے حالات کچھ ایسے دُہائی ہی دُہائی ہے
مقابل اِک فصیل جبر ہے اور نارسائی ہے
جسے اب چن لیا ہے اُس پہ ہی چلنا مقدر ہے
کہ اب جو راستہ بدلا تو اس میں جگ ہنسائی ہے
جسے اپنا سمجھ بیٹھی تھی میں جوشِ محبت میں
مجھے معلوم کیا تھا یہ خوشی اتنی پرائی ہے
شکوک و وہم کی آندھی اگرچہ تھم چکی کب سے
یہ کس نے خاک پھر سے بدگمانی کی اُڑائی ہے
جو ہیں اس کاسۂ جیون میں چند اِک درد کے سکے
یہی ہے عمر کا حاصل یہی میری کمائی ہے
یہ بھائی آج جو بھائی سے یوں دست و گریباں ہیں
فضا نفرت حقارت کی یہاں کس نے بنائی ہے
مجھے یہ گردشِ ایام کس منزل پہ لے آئی
میں تنہا اِک طرف اور اِک طرف ساری خدائی ہے

جنوں کا سلسلہ کیا ہے، نہ تو جانے نہ میں جانوں
سدا سے یہ صدا کیا ہے نہ تو جانے نہ میں جانوں
ازل سے تا ابد ہے ایک جیسا ہی سفر جاری
خدا اور نہ ناخدا کیا ہے، نہ تو جانے نہ میں جانوں
ازل سے تا ابد ہے ایک جیسا ہی سفر جاری
خدا اور نہ ناخدا کیا ہے، نہ تو جانے نہ میں جانوں
کوئی کردار ہیں ہم، جو نبھائے جا رہے ہیں سب
وفا کیا ہے جفا کیا ہے نہ تو جانے نہ میں جانوں
ازل سے ایک قانونِ ابد لاگو ہے ہم سب پہ
بجز اس کے سنا کیا ہے نہ تو جانے نہ میں جانوں
ہمیں اِک دُوسرے سے ہی کوئی فرصت نہیں ملتی
کسی نے کچھ کہا کیا ہے، نہ تو جانے نہ میں جانوں
نگاہوں ہی نگاہوں میں ہوئے پیمان پل بھر میں
وفاداری بلا کیا ہے، نہ تو جانے نہ میں جانوں
ترے احساس سے نورین جو ہوتا ہے لکھتی ہوں
مگر میں نے لکھا کیا ہے، نہ تو جانے نہ میں جانوں

اُس پہ کر اعتبار بیٹھی ہوں
اپنا سب کچھ میں ہار بیٹھی ہوں
وصل کے اِک حسین لمحے میں
سارا جیون گزار بیٹھی ہوں
تیری خواہش کی زندگی کے لیے
اپنی خواہش کو مار بیٹھی ہوں
آ بس اِک بار دیکھنے کے لیے
پھر سراپا سنوار بیٹھی ہوں
مہلتِ انتظار ہی نہ ملی
کرنے جب انتظار بیٹھی ہوں
تو نے چھوڑا تھا جس جگہ اب بھی
میرے غفلت شعار، بیٹھی ہوں
میری خاطر ہی پار آ جاؤ
میں بھی دریا کے پار بیٹھی ہوں
کل بھی دل مانتا نہ تھا میری
اب بھی بے اختیار بیٹھی ہوں
وہ نہ آیا سنبھالنے نورین
راہ میں بے شمار بیٹھی ہوں

اس نے اتنی بڑی خوشی دی ہے
ایک لمحے میں زندگی دی ہے
میرے چاروں طرف اُجالا ہے
یوں اندھیروں کو روشنی دی ہے
کوئی بدصورتی نہیں باقی
ایسے جیون کو دلکشی دی ہے
ہو گئی ہے محیط عالم پہ
جو خبر تو نے سرسری دی ہے
بے سکونی کو اک سکون ملا
تو نے صحرا کو اِک کلی دی ہے
وہ ہے میرا، فقط وہ میرا ہے
یہ صدا میں نے ہر گلی دی ہے

الحمرا قومی ادبی وثقافتی کانفرنس

آغا تنویر

12-13-14 کوالحمراء میں منعقد ہوئی جس میں ملک بھر سے نامور شاعروں، ادیبوں، موسیقاروں، گلوکاروں، فنکاروں اور مصوروں نے شرکت کی۔ افتتاحی اجلاس 12 اکتوبر کو سہ پہر 3 بجے الحمرا ہال نمبر II میں ہوا۔ اس اجلاس میں وزیر اعلیٰ پنجاب میاں شہباز شریف نے بطور مہمانِ خصوصی شرکت کی۔ اس اجلاس کا موضوع تھا رواں صدی میں اُردو زبان و ادب کے امکانات تعارفی کلمات چیئرمین الحمراء آرٹس کونسل جناب عطاء الحق قاسمی نے ادا کیے۔ خیر مقدم محی الدین احمد وانی (سیکرٹری اطلاعات وثقافت) جبکہ کلیدی خطبہ معروف ادیب انتظار حسین نے دیا۔ میاں شہباز شریف نے اظہار خیال میں اُردو زبان کی اہمیت، ترویج اور ترقی پر زور دیا۔ 5 بجے چائے کے وقفہ کے بعد ''پاکستان میں کہانی کا عروج وزوال'' کے عنوان سے الحمرا ہال نمبر II میں تقریب ہوئی۔ صدارت منیر بادینی نے کی جبکہ مہمان خصوصی نور الہدیٰ شاہ تھے۔ اس موضوع پر مسعود اشعر، ڈاکٹر شاہ محمد مری، ڈاکٹر تحسین فراقی، ہبین مرزا، آصف فرخی، ڈاکٹر سعادت سعید، شکیل عادل زادہ، جمیل پال، ڈاکٹر محمد صغیر خاں، ڈاکٹر مرحب قاسمی اور مبصرین میں ڈاکٹر روبینہ ترین، ڈاکٹر اشفاق احمد ورک، عرفان جاوید، عدنان عادل اور رئیس فاطمہ کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔ اسی روز رات 8 بجے محفل موسیقی ہوئی جس میں غلام عباس، عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی، زرقا اور محمد علی شہکی نے اپنی سحر انگیز آواز کا جادو جگایا اور کثیر تعداد میں آئے ہوئے سامعین کے دل موہ لیے۔

دوسرے روز پہلی نشست صبح 11 بجے الحمرا ہال III میں منعقد ہوئی جس کا عنوان تھا ''سعادت حسن منٹو خصوصی مطالعہ'' صدارت عبداللہ حسین نے کی۔ مہمانانِ اعزاز پروفیسر فتح محمد ملک تھے۔ مہمانانِ خصوصی میں ڈاکٹر سلیم اختر، کشور ناہید، نگہت منٹو اور نصرت منٹو جبکہ اظہارِ خیال میں ڈاکٹر محمد علی صدیقی، ڈاکٹر تبسم کاشمیری، ڈاکٹر انوار احمد، زاہدہ حنا، یونس جاوید اور اصغر ندیم سیّد کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔ مبصرین میں ڈاکٹر نجیب جمال، ڈاکٹر عقیلہ شاہین اور ڈاکٹر عامر سہیل شامل تھے۔ لنچ کے بعد تیسری نشست سہ پہر 3 بجے الحمرا ہال III میں منعقد ہوئی۔ اس کا موضوع تھا ''عالمی سطح پر پاکستانی مصوری کا مقام'' صدارت میاں اعجاز الحسن اور مہمانِ خصوصی سعید اختر تھے۔ ڈاکٹر اعجاز، ڈاکٹر راحت نوید مسعود، شاہ نواز زیدی، قدوس مرزا، سائرہ ڈار نے اظہارِ خیال کیا اور تبصرہ عقیل عباس جعفری نے فرمایا 5 بجے اسی ہال میں ''پاکستان میں موسیقی کے حال ومستقبل'' کے حوالے سے نشست ہوئی جس کی صدارت پٹیالہ (پٹیالہ گھرانہ) کے اُستاد فتح علی خان کے مہمانانِ خصوصی اُستاد غلام حسن شگن محمد علی شہکی تھے۔ اظہار خیال غلام علی شوکت، ڈاکٹر عمر عادل، اُستاد شفقت علی خاں، سارہ زمان اور غلام عباس نے کیا۔ رات 8 بجے الحمراء ہال II میں محفل مشاعرہ کی تقریب ہوئی جس میں حاضر شعراء نے اپنا کلام پیش کیا۔ اس کی صدارت ظفر اقبال نے کی۔ مہمانِ خصوصی پیرزادہ قاسم تھے۔ اس مشاعرہ کی نظامت عطاء الحق قاسمی نے کی جس کی وجہ سے مشاعرہ کو چار چاند لگ گئے۔ تیسرے اور آخری روز ''بچوں کے ادب سے بے اعتنائی کا مسئلہ'' پر نشست ہوئی۔ صدارت ڈاکٹر خواجہ زکریا نے کی۔ مہمانِ خصوصی ڈاکٹر انور محمود خالد، ڈاکٹر شفیق احمد، ڈاکٹر طاہر تونسوی، ڈاکٹر فخر الحق نوری، ڈاکٹر مرحب قاسمی، ڈاکٹر فاطمہ حسن، ابصار عبدالعلی، اختر عباس، شعیب مرزا تھے۔ نوید حیدر ہاشمی، نواز ڈوکی، اسلم سحر نے تبصرے کیے۔

اسی روز ادب اور معاشرہ پر میڈیا کے اثرات کے حوالے سے اس کانفرنس کی سب سے بھرپور نشست ہوئی جس کی صدارت منو بھائی نے کی۔ اظہارِ خیال کرنے والے حضرات میں محمود شام، عرفان صدیقی، مجیب الرحمٰن شامی، عارف نظامی، نذیر ناجی، حسن نثار، حامد میر، جاوید چوہدری، سہیل وڑائچ، آفتاب اقبال اور یا مقبول جان، نصرت جاوید، طلعت حسین، زمیرہ نظامی، نسیم زہرہ، سلیم صافی، افتخار احمد، عطاء الرحمٰن، سجاد میر، جنید سلیم، خاور نعیم ہاشمی، عطاء الحق قاسمی اور یاسر پیرزادہ شامل تھے۔ اسی 5:30 شام الحمراء ہال III میں ''پاکستان میں تھیٹر کی صورت حال'' کے حوالے سے نشست ہوئی جس کی صدارت سرمد صہبائی مہمانِ خصوصی عثمان پیرزادہ تھے۔ اظہارِ خیال کرنے والوں میں غازی صلاح الدین، مسعود اختر، سلمان شاہد، احمد شاہ، سہیل احمد، قوی خان، ثروت علی، توقیر ناصر نے کیا۔ اس نشست میں ناہید صدیقی نے کلاسیکی رقص بھی پیش کیا جسے حاضرین نے بھرپور سراہا۔ اس طرح یہ خوبصورت اور کامیاب کانفرنس اختتام پذیر ہوگئی جس میں کثیر تعداد میں لوگوں نے شرکت کی۔ تین روز تک لاہور آرٹس کونسل میں میلے کا سماں رہا۔ اس موقع پر منو فلم و ڈرامہ فیسٹول کا اہتمام بھی کیا گیا اور بک فیئر بھی لگایا گیا جس میں کتاب سے محبت رکھنے والے لوگوں نے شرکت کی۔

ادبی خبریں/تقریبات

نگہت اکرم/لاہور

حلقہ ارتقائے ادب کا تعزیتی اجلاس

حلقہ ارتقائے ادب کا تعزیتی اجلاس ۱۵ ستمبر ۲۰۱۲ء مرحوم شہزاد احمد کی یاد میں سوسائٹی سکول مغلپورہ لاہور منعقد ہوا۔ صدارت علامہ بشیر رمزی نے کی۔ جبکہ مہمان خاص توحید شہزاد تھے۔ نظامت کے فرائض جناب ریاض رومانی نے سرانجام دیے۔

احسان اللہ ثاقب، ریاض رومانی، طفیل عزمی نے مرحوم شہزاد احمد پر مضامین پڑھے۔ علامہ رمزی، پروفیسر عباس مرزا، حسنین بخاری، ڈاکٹر اخلاق گیلانی نے بھی اظہار خیال کیا۔ احسان اللہ ثاقب، اقبال کیفی، اکرم سحر فارانی نے منظوم کلام پیش کیا۔ توحید شہزاد نے اس تقریب کے انعقاد پر اظہارِ تشکر پیش کیا۔ آخر میں دُعائے خیر پیش کی گئی۔ شعراء کی ایک بڑی تعداد نے اس تقریب میں شرکت کی۔

پنجاب رنگ

پاکستان کا پہلا پنجابی ایم اے چینل ۹۵ پنجاب رنگ کا قیام پنجاب انسٹیٹیوٹ آف لینگویج آرٹ اینڈ کلچر (PILAC) انفارمیشن اینڈ کلچر ڈیپارٹمنٹ پنجاب حکومت کے زیر اہتمام ہو چکا ہے۔ اسے www.punjabrungfan95.com پر سنا جا سکتا ہے۔

اکیڈمی ادبیات سندھ کراچی

اکیڈمی ادبیات سندھ کراچی اور انجمن ترقی پسند مصنفین کراچی کے زیر اہتمام ایک ادبی ریفرنس محترمہ ہاجرہ سرور (مرحومہ) کے لیے ۱۰/اکتوبر ۲۰۱۲ء بمقام اکیڈمی ادبیات آڈیٹوریم لیاقت نیشنل لائبریری میں منعقد کیا گیا جس کی صدارت ڈاکٹر عمر محمد علی صدیقی نے کی۔ مہمان خصوصی محترمہ نوشین احمد دختر ہاجرہ مسرور تھیں۔

مقررین غلام بھٹی مغل، فردوس حیدر، طاہر نقوی، صبا اکرام، ڈاکٹر تجمل نقوی، ممتاز زبیر، زیب النساء زیبی، آغا نور محمد پٹھان۔

مضمون خراج عقیدت: عقیدت اللہ اشاعت حزروی، حامد علی سیّد

ادبی تنظیم ادراک مشاعرہ

۵/اکتوبر ۲۰۱۲ء الحمرا ادبی بیٹھک لاہور میں محفل مشاعرہ منعقد ہوا۔ جس کی صدارت خالد اقبال یاسر نے کی۔ مہمان خصوصی حسن جاوید، حسین مجروح، ریاض رومانی، اعظم کمال تھے۔ مشاعرہ کا باقاعدہ آغاز تلاوت کلامِ پاک سے ہوا۔ تلاوتِ کامران ناشاد نے کی۔ جبکہ نعت رسول مقبولؐ وقار محمود اور سجاد نے کی۔

نظامت کے فرائض شہباز شاہین نے ادا کیے۔ شعراء کرام جنہوں نے اپنا کلام پیش کیا بشیر رومی، اقبال راہی، منظر حسین اختر، غفور شیراز، شفیق احمد خان، واجد امیر، محمد افضل، جاوید قاسم، ارشد منظر، عرفان صادق، شاہدہ دلاور شاہ، عینی راز، حسن بانو، عذرا مرزا، ریحانہ اشرف، کامران ناشط، سلطان محمود، عمران جعفر، فراست بخاری، ارسلان ارسل، فہد محمود، مکرم علی، شہباز شاہین، نگہت اکرم اور کئی شعراء شامل تھے۔

پروین شاکر عکس ایوارڈ

۶/اکتوبر ۲۰۱۲ء PNCA اسلام آباد میں ایک تقریب منعقد ہوئی جس میں پروین شاکر عکس خوشبو ایوارڈ دیے گئے۔

''چاک سے اُترے وجود'' شہزاد نیر کے شعری مجموعے کو 2009ء کے عکس خوشبو ایوارڈ سے نوازا گیا۔

''اک شام تمہارے جیسی ہو'' حسن عباسی کے شعری مجموعہ کو ۲۰۱۰ء کا عکس خوشبو ایوارڈ دیا گیا۔

سیوا آرٹس سوسائٹی

سیوا آرٹس سوسائٹی کے زیر اہتمام ادبی بیٹھک لاہور میں ایک محفل مشاعرہ کا انعقاد ہوا۔ صدارت جناب خالد شریف نے کی۔ جبکہ مہمانِ خصوصی سعید الظفر صدیقی اور اقبال رمیز تھے۔

نظامت کے فرائض سیوا آرٹ سوسائٹی کے روح رواں عرفان صادق نے انجام دیے۔ شعراء اکرام میں زاہد ہما، جاوید قاسم، رضا عباس رضا، جاوید رضی، ڈاکٹر عاصم بخاری، ریحانہ اشرف، طاہرہ جبین، ثمینہ سیّد، نگہت اکرم، عمران جعفر، گلزار بخاری، اعجاز فیروز، صائمہ کامران اور ڈاکٹر کامران نے اپنا کلام پیش کیا۔

ادبی خبریں/تقریبات

اِدراک مشاعرہ

ادبی تنظیم ادراک کے زیر اہتمام ادبی بیٹھک (الحمراء) میں محفل مشاعرہ منعقد کی گئی جس کی صدارت فرمائی جناب خالد اقبال یاسر نے۔ مہمانانِ خصوصی جناب حسین مجروح، جناب حسن جاوید، میجر اعظم کمال اور جناب ریاض رومانی۔ تلاوتِ قرآن حکیم کی سعادت جناب کامران ناشط کو حاصل ہوئی۔ نعت رسولِ مقبول ﷺ سے قلب و رو کو معطر کیا جناب سجاد بری اور ننھے ثنا خوان وقار محمود نے۔ نظامت کے فرائض شہباز شاہین نے ادا کیے۔ دیگر شعراء کرام کے اسمائے گرامی ہیں:

جناب علامہ بشیر رزمی، جناب اقبال راہی، جناب منظر حسین اختر، جناب غافر شہزاد، جناب شفیق احمد خان، جناب واجد امیر، جناب محمد افضل، جناب جاوید قاسم، جناب عرفان صادق، محترمہ شاہدہ دلاور شاہ، جناب ارشد منظور، جناب ایاز الغنی، محترمہ عینی راز، محترمہ حسن بانو خان، محترمہ عذرا مرزا، محترمہ ریحانہ اشرف، جناب کامران ناشط، جناب سلطان محمود، جناب عمران جعفر، محترمہ نگہت اکرم، جناب ارسلان احمد ارسل، جناب فراست بخاری، جناب فہد محمود سوختہ اور مکرم علی۔

ممتاز شاعر اور ادیب سیّد نظر زیدی کی یاد میں ادیب ریفرنس

معروف ادبی تنظیم ''امثال'' کے زیر اہتمام اُردو ادب کی ایک معتبر شخصیت سیّد نظر زیدی مرحوم کی یاد میں سالانہ ادبی ریفرنس الحمرا ہال میں منعقد ہوا۔ صدارت ڈاکٹر سلیم اختر نے کی جبکہ مہمانانِ خصوصی وزیر اعلیٰ پنجاب کی معاون خصوصی برائے ہائر ایجوکیشن محترمہ نسرین نواز اور ڈاکٹر اجمل نیازی تھے۔ نظامت کے فرائض ایوب ندیم نے انجام دیے۔ اس ادبی ریفرنس میں صاحب صدارت اور مہمانانِ خصوصی کے علاوہ نجیب احمد، سرفراز سیّد، ڈاکٹر مختار احمد عزمی، گلزار بخاری، ناصر حسین زیدی، شعیب مرزا، پروین سجل اور خورشید علی زیدی نے سیّد نظر زیدی مرحوم کی حیات اور اُن کی ادبی خدمات کے حوالے سے اظہار خیال کیا۔ کامران نذیر نے منظوم خراجِ عقیدت پیش کیا اور گلوکار سجاد بری نے نظر زیدی مرحوم کا کلام گا کر پیش کیا۔ (ایوب ندیم)

فیض گھر

''ادب سرائے'' کے زیر اہتمام ''فیض گھر'' میں ایک خوبصورت نعتیہ محفل مشاعرہ انعقاد پذیر ہوئی۔ صدارت معروف شاعر ایوب ندیم نے کی۔ جبکہ میز بانی کے فرائض جاوید شیدا نے انجام دیے۔ اس بابرکت نعتیہ محفل مشاعرہ میں ایوب ندیم، ڈاکٹر شہناز مزمل، جاوید رضی، احسان اللہ ساحر، سعید قریشی، عذرا اشرف، ریحانہ اختر، گلوکار عدیل برکی، حسن اعزاز، جاوید شیدا اور دیگر شعرائے کرام نے ہدیہ نعت بحضور سرور کائنات پیش کرنے کی سعادت حاصل کی۔

بزم پرنم الٰہ آبادی کی افتتاح تقریب

(لاہور پ ر) برصغیر پاک و ہند کے ممتاز شاعر اور بھر دو جھولی میری یا محمد اور دیگر شہرہ آفاق نعتوں کے خالق پرنم الٰہ آبادی مرحوم کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے اُن کے ایک شاگرد خاص اقبال قیام شجاع آبادی نے بزم پرنم کی بنیاد رکھی جس کا مقصد اُستاد الشعراء پرنم الٰہ آبادی کے کام کو عام لوگوں تک پہنچانا اور ان کے نام کو زندہ رکھنا ہے۔ اس مقصد کے لیے سماجی کارکن وارث اقبال (المعروف وارث نہاری والے) نے پیسہ اخبار انارکلی میں ایک کمرہ مخصوص کیا ہے۔ گزشتہ دنوں یہاں افتتاحی تقریب ہوئی۔ ممتاز آرٹسٹ خیالی نے فیتہ کاٹ کر اس کا باقاعدہ افتتاح کیا۔ اس موقعہ پر پرنم الٰہ آبادی کے شاگرد اقبال پیام شجاع آبادی کے علاوہ حسن عباسی، حکیم سلیم اختر ملک، میاں علاؤ الدین، وارث اقبال، سعد اللہ شاہ، عمران شناور، سیّد فراست بخاری اور اقبال راہی بھی موجود تھے۔ دفتر کے افتتاح کے بعد خیالی صاحب کی صدارت میں ایک مختصر سی تقریب ہوئی۔ اس

موقعہ پر معروف نعت گو عبدالمجید چٹھہ نے تلاوت اور نعت رسول پیش کی۔ اقبال پیام شجاع آبادی نے اپنے اُستاد محترم پرنم الٰہ آبادی کو منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔ پنجاب پولیس کے آفیسر چار کتابوں کے مصنف میاں علاء الدین نے پرنم الٰہ آبادی کی ادبی خدمات کے حوالے سے پرمغز گفتگو کی اور منتظم بزم کی کاوشوں کو سراہا۔ انہوں نے نعت اور اس کی افادیت پر بھی تفصیل سے روشنی ڈالی۔ روزنامہ دُنیا کے ادبی ایڈیشن کے نگران نامور شاعر سعداللہ شاہ نے کہا کہ ایسے شاعروں کو یاد کرنا اور یاد رکھنا بڑی اعلیٰ ظرفی کا کام ہے۔ ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم اپنے مشاہیر کو بھولتے جا رہے ہیں اور ان کی خدمات کو بھی فراموش کر رہے ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ ہم ایسے لوگوں کو بھرپور انداز میں خراجِ عقیدت پیش کریں۔ مشہور شاعر حسن عباسی نے اقبال پیام کو مبارک باد دیتے ہوئے توقع ظاہر کی کہ وہ اپنے اُستاد کی یادوں کے چراغ روشن رکھنے کے لیے خلوص دل سے خدمات انجام دیں گے۔

میزبان تقریب وارث اقبال نے کہا کہ میرے مراسم پرنم الٰہ آبادی سے بے حد مخلصانہ تھے۔ وہ کمال کے انسان اور لاجواب شاعر تھے۔ ان کا کلام خصوصاً نعتیہ کلام دُنیا کے ہر خطے میں گونج رہا ہے۔ انہوں نے اس امر پر خوشی کا اظہار کیا کہ اقبال پیام نے یہ بیڑہ اُٹھایا۔ انہوں نے کہا کہ اُستاد کی یاد میں تقریب کا سلسلہ اگلے ماہ سے شروع کیا جائے گا۔ اقبال پیام نے کہا کہ میں نے اپنے خرچے پر اُستادِ محترم کی دو کتابیں شائع کرائیں اور میرا ارادہ ہے کہ ان کا تمام کلام کتابی شکل میں منظرعام پر لاؤں گا۔ اس تقریب کی نظامت کے فرائض اقبال راہی نے انجام دیے۔ آخر میں اقبال پیام اور وارث اقبال کی جانب سے تمام حاضرین کو مٹھائی اور نہاری کھلائی گئی اور پرنم الٰہ آبادی کی مغفرت اور ان کے درجات بلند کرنے کی دُعا کی گئی۔ (رپورٹ: اقبال راہی)

محفل مشاعرہ

گزشتہ دنوں حرف اکیڈمی راولپنڈی کے زیر اہتمام اُچ شریف سے آئے ہوئے معروف شاعر سیّد فہیم کاظمی کے اعزاز میں محفل مشاعرہ منعقد کی گئی۔ محفل کی صدارت نامور اور سینئر شاعر جناب ضیاء الدین نعیم نے کی۔ جبکہ مہمان خصوصی معروف شاعر، ادیب اور کئی ادبی تنظیموں کی آبیاری کرنے والے محترم نسیم سحر تھے۔ نظامت کے فرائض حرف اکیڈمی کی سیکرٹری جنرل محترمہ فرزانہ جاناں نے ادا کیے۔ دیگر شعراء میں جناب آفتاب ضیاء، جناب کرنل سیّد مقبول حسین، جناب اسد بیگ، جناب ارشد ملک، جناب الیاس بابر اعوان، جناب گل نازک، جناب نوید ملک، جناب مظہر مسعود اور جناب صدیق سرمد شامل تھے۔ تمام شعراء نے نہایت عمدہ کلام پیش کیا۔ مہمانِ اعزاز جناب سیّد فہیم کاظمی نے حرف اکادمی کا شکریہ ادا کرنے کے ساتھ ساتھ اپنا خوبصورت کلام پیش کیا۔ صدارتی کلمات ادا کرتے ہوئے جناب ضیاء الدین نعیم نے کہا کہ حرف اکادمی بلاشبہ ایک کامیاب ادبی تنظیم ہے جو کہ ادبی تقریبات اور مشاعرے منعقد کرانے میں کوئی ثانی نہیں رکھتی۔ اُنھوں نے اس کامیاب مشاعرے پر حرف اکادمی کو مبارک باد دی۔ چند شعراء کا نمونہ کلام:

جناب نسیم سحر (مہمانِ خصوصی):

ٹوٹا پڑتا ہے ہر شب مجھے شیشے کی طرح
تنگ آیا ہوں بہت خواہش تعمیر سے میں

جناب ضیاء الدین نعیم (صدرِ محفل):

بشریت کے تقاضے بھی تو ہیں
یہ نہ سمجھو کہ یونہی بولتا ہوں

جناب کرنل سیّد مقبول حسین:

کام تھا اس لیے نہیں آئے
یہ بہانہ، بہانہ تھوڑی ہے

جناب آفتاب ضیاء:

عیسائی ہو، یہودی ہو یا ہوں مسلمان
انسان ہی نہیں جسے وحشت عزیز ہے

جناب اسد بیگ:

جو ہوش مند ہیں بیٹھے ہیں سب کنارے پر
خدا کا شکر ہے پانی پہ چل رہا ہوں میں

فرزانہ جاناں:

کھو گیا تھا جو غبارِ مصر میں یوسف کہیں
اُس کو جذبِ دل سے ہم نے ماہِ کنعاں کر دیا

جناب الیاس بابر اعوان:

مجھ سا اسلوب زمانے سے کہاں بنتا ہے
واقعہ بات بنانے سے کہاں بنتا ہے

مشاعرہ کے آخر میں حرف اکادمی کے وائس چیئرمین جناب اسد بیگ نے تمام حاضرین محفل کا شکریہ ادا کیا۔ (رپورٹ: فرزانہ جاناں)

نامہ ہائے احباب

ایک عرصہ بعد ستمبر ۲۰۱۲ء کا ''ارژنگ'' ملا۔ میں نے ایک بار پہلے بھی آپ کو تحریر کیا تھا اور اس وقت بھی ایک مدت بعد مجھے پرچہ موصول ہوا تھا کہ کیا پرچہ باقاعدہ نہیں چھپتا؟ بہرصورت ستمبر کا شمارہ بھیجنے کا شکریہ۔ اللہ آپ کو خوش رکھے۔

شفیع عقیل

کراچی

❀❀❀

خوب سے خوب تر حسن عباسی صاحب!

السلام علیکم! ارژنگ خوب نکالا ہے آپ نے۔ حَسن اور حُسن کا مرقع دیکھ کر طبیعت خوش ہوتی ہے۔ آپ نے ہزارے کی طرف بھی نظر خوش گماں دراز کی ہے۔ آپ کے قلم کے ''دستِ قلم'' تو ضرور ہیں دل کے بھی کھلے کھلے ہیں۔ آپ نے میری غزل کو پیار سے دیکھا ہے۔ آپ کی خوش شیوگی رسالے کو محیط ہے۔ میری غزل کا ایک مصرع کچھ غلط ہو گیا ہے۔ اس میں میری اپنی بدخطی کا قصور ہے۔ یہاں پانچویں شعر کے دوسرے مصرعہ میں ترکیب بغض وریا کا ''و'' ''د'' بن گیا ہے۔ لفظ بغض کے ساتھ لفظ ''ریا'' کو جوڑا گیا تھا۔ رسالے کے متفرقات دل افروز ہیں۔ آپ ''ارژنگ'' کی معنویت پر پورے اُتر رہے ہیں۔ اس باب میں ادارے کے بھی شریک آپ کا حوصلہ بڑھاتے ہیں۔ آج یومِ عشق رسولؐ ہے۔ اس خصوص میں میرا دل بھی زخم زخم ہے۔ میں نے چند اشعار کہے ہیں۔ آپ اس سلسلے کا گوشہ ترتیب دے رہے ہوں تو میں آپ کو یہ اشعار بھیجوں۔ میں نے اشعار اخباروں میں بھیجے ہیں کہ وقت کا تقاضا یہی تھا۔ اُمید ہے آپ اور احباب راضی رضامند اپنے اپنے فرائض کی بجا آوری میں مصروف ہوں گے۔ سب کے لیے نیک خواہشات کے ساتھ......

خیر اندیش

آصف ثاقب

ایبٹ آباد، ہزارہ

❀❀❀

محترم ومکرم جناب حسن عباسی صاحب!

سلام مسنون! سب سے پہلے عید الاضحیٰ کی پیشگی مبارک باد! ایک ادبی خبر اور ''ملالہ'' کے حوالے سے ایک نظم برائے ارژنگ ارسالِ خدمت ہیں۔ میرا اور مسعود احمد کا پرخلوص سلام!

نیاز کیش

احمد جلیل

❀❀❀

برادرِ مکرم حسن عباسی صاحب!

سلام مسنون!

ماہنامہ ''ارژنگ'' باقاعدگی سے مل رہا ہے۔ شکریہ۔ تازہ شمارے میں آپ کی شاعری کا انتخاب اور نئی غزل پڑھ کر لطف آ گیا۔ ماشاءاللہ آپ کی شاعری تو شروع ہی سے دل پذیر ہے۔

ایک نوجوان شاعر جو ڈیرہ اسماعیل خان کے ایک دیہات میں رہتا ہے اُس نے مجھے اپنی اکٹھی کئی تخلیقات بھجوائی ہیں۔ میں ان میں سے کچھ غزلیں ارسال کر رہا ہوں براہِ کرم ایک نوٹ کے ساتھ چھاپ سکیں تو حوصلہ افزائی ہوگی۔

اپنی بھی کچھ چیزیں آپ کے حکم کی تعمیل میں پیش خدمت ہیں۔ اللہ آپ کی توفیقات میں اضافہ فرمائے۔

والسلام

شہاب صفدر

❀❀❀

برادرِ محترم حسن عباسی صاحب!

السلام علیکم!

اُمید ہے آپ مع الخیر ہوں گے۔ ستمبر کا ارژنگ ہمارے سامنے ہے جو اس بات کی تائید

کرتا ہے کہ آپ، عامر بن علی اور آپ کے دیگر رفقائے کار اُردو کے سچے محسن ہیں۔ اُردو ادب و صحافت کی بے لوث خدمت کر رہے ہیں۔ ماشاء اللہ آپ کا یہ پرچہ کسی بھی اعلیٰ پائے کے پرچے سے کم نہیں۔ نظم و نثر کی ہر تخلیق لاجواب ہے۔ شعراء کرام کے شعری گوشوں کا اہتمام بھی لائق تحسین ہے۔ آئندہ شمارے کے لیے چند چیزیں ارسال خدمت ہیں۔ قبول فرمایئے۔

برادرعزیز

ریاض ندیم نیازی

سبی (بلوچستان)

❀❀❀

پیارے حسن عباسی اور عامر بن علی

آپ پر سلامتی ہو۔

''ارژنگ'' باقاعدگی سے مل رہا ہے۔ گزشتہ شمارے میں آپ نے شاعری کو بھی جگہ دی۔ سو عزت افزائی اور یادفرمائی پر خوشی ہوئی۔ اللہ تعالیٰ آپ کی توفیقات میں اضافہ فرمائے۔

پرچہ آپ کا خوب ہے۔ شاعری، ادب، تبصرے، تجزیے اور خبریں مانو کہ وہ بھی کچھ مل جاتا ہے جو کسی بھی طرح ادب اور ادبی دنیا سے علاقہ رکھتا ہے۔ سو تازہ شمارہ دیکھ کر جی خوش ہوا اور دل سے آپ کے لیے دُعا نکلی۔

کچھ تازہ شاعری ہوئی تھی تو سوچا آپ کو بھیج دوں۔ یقیناً ''ارژنگ'' کے قارئین کے لیے حظ اور دلچسپی کا باعث بنے گی۔ سو تازہ غزلیں اور ایک نظم حاضر خدمت ہے۔

ایک تاثراتی سا مضمون بھی ساتھ میں رکھ دیا ہے۔ اگر دل چسپی کا سامان نظر آئے تو چھاپ دیجیے گا۔ آپ پڑھ کر خود ہی خود مسکرا اُٹھیں گے۔ تو بھی مجھے لگے گا کہ محنت ثمر بار ہوگئی۔

تمام احباب اور لاہور کے ادبی حلقے کے لیے سلامتی کی دُعا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ہنستا بستا اور شاد آباد رکھے۔

خیراندیش

سیّد کامی شاہ

❀❀❀

پیارے دوست حسن عباسی!

السلام علیکم!

اُمید ہے مزاج اچھے ہوں گے۔ میں آپ کی محبتوں کا مقروض ہوں۔ ''ارژنگ'' باقاعدگی سے ملتا ہے۔ شمارہ جون میں میری کتاب ''محبت کے جزیرے میں'' سے گوشہ شامل کرنے اور شمارہ ستمبر میں میری کتاب پر مرزا خورشید بیگ میلسوی کا مضمون شامل کرنے پر بے حد ممنون ہوں۔

''ارژنگ'' کا یہ انداز بہت پسند آیا کہ ہر ماہ مختلف دوستوں کا گوشہ شامل ہوتا ہے۔ ایک طرف اُن کی پذیرائی کا بہترین ذریعہ ہے۔ دوسری طرف اُن دوستوں کا اچھا خاصہ کلام پڑھنے کا موقع میسر آتا ہے جن سے ملاقات نہیں ہوتی یا جن کا کلام یا کتب دستیاب نہیں ہوتی یا نہیں پڑھ پاتے۔

ایک شاعر کے منتخب اشعار والا سلسلہ خوب ہے اسے جاری رہنا چاہیے۔ ڈاکٹر کوثر محمود ملیں تو میری طرف سے پوچھئے گا۔ ''کون تھی وہ''

عامر بن علی اور ابرار ندیم کو بے حد سلام۔

راؤ وحید اسد

ملتان

❀❀❀

محترم حسن عباسی صاحب!

سلامِ خلوص!

میرے بھائی دستگیر شہزاد نے آپ کے نئے ادبی پرچے کے بارے میں بتایا تو میں نے آپ کو مبارک باد دی۔ دُعا ہے دن رات چوگنی ترقی کرے اللہ کے فضل وکرم سے۔ نگارشات بھیج رہی ہوں۔ میرے سیل نمبر پہ چھوٹا سا ایم ایس کر دیجئے گا جب رجسٹرل جائے۔ کیونکہ ایک ماہ پہلے بھی رجسٹرڈ معاصر کو بھجوایا تھا تو نہیں ملا۔ ڈاک خانے والوں سے پھر دو ہاتھ کر لوں۔ اگر اب آپ کو نہ ملا تو......

میرے بھائی دستگیر نے آپ کی اتنی تعریف کی ہے کہ بس کیا بتاؤں۔ کہتے ہیں حسن عباسی تو میرا بھائی ہے۔ آپ کے پرچے میں جگہ ملے گی تو انشاء اللہ پھر حاضر ہوں گی۔

آپ کی محبت ہمیں دوبارہ کھینچ لائے گی۔

اللہ حافظ

مخلص نسیم سکینہ صدف

ڈسکہ

❀❀❀

بقیہ انٹرویو منو بھائی

س: اُردو ادب پر ترقی پسند تحریک کے اثرات کو کس طرح دیکھتے ہیں؟

جواب: جو بھی انسان کی محرومی، خواہشوں، آرزوؤں کی بات کرتا ہے وہ ترقی پسند ہے۔ وہ منٹو ہو، فیض ہو یا انتظار حسین ہو۔ میرے خیال میں ہر وہ لکھنے والا جو انسان کے حق کی بات کرتا ہے وہ ترقی پسند ہے۔ ان معنوں میں میں انتظار حسین کو بھی ترقی پسند سمجھتا ہوں۔

س: پاکستان کا مستقبل کیا ہے؟

جواب: ہمیں ماضی کی طرف لے جایا جا رہا ہے۔ جبکہ ہم مستقبل کی طرف جانا چاہ رہے ہیں۔ یہ جو انتہا پسندی جیسے رویے ہیں یہ ہمیں ماضی کی طرف لے جانے والے رویے ہیں۔ میرے خیال میں بنیاد پرستی اور انتہا پرستی کی یہ آخری ریل چل رہی ہے۔ اس کے بعد ہم اپنے اصل راستے کی طرف واپس آئیں گے اور پاکستان کی تعمیر اصل معنوں میں کریں گے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آج بھی تحریک پاکستان چل رہی ہے۔ آج کا پاکستان قائد اعظم، علامہ اقبال اور قائد عوام ذوالفقار علی بھٹو کا پاکستان نہیں۔

س: رمشا کیس کے حوالے سے آپ کا کیا موقف ہے؟

جواب: پہلی دفعہ یہ ہوا ہے کہ ہمارے علماء نے حق اور انصاف کی بات کی ہے۔ ایک ایسی بچی کے بارے میں جو کہ ذہنی طور پر نارمل نہیں یہ کہنا کہ وہ توہین قرآن کی مرتکب ہوئی ہے اپنی جگہ خود ایک ابنارمل رویہ ہے۔ پہلی دفعہ اس کیس میں نظر آ رہا ہے کہ جج بغیر کسی دباؤ کے فیصلہ کر سکیں گے۔ ہمیں یہ سوچنا چاہیے کہ قیامِ پاکستان سے پہلے ہم ہندوستان میں خود ایک اقلیت تھے۔ آج ہمیں اقلیتوں کو تنگ کرتے وقت شرم محسوس کرنی چاہیے۔

بقیہ انٹرویو جمشید مسرور

دوران مجھے خیر "سوئی کے ناکے" سے انہوں نے نہیں گزارا۔ اس کے علاوہ لارس سوبے اور کرسٹن اور ارلنگ کٹرسن کے تراجم کو بھی لوگوں نے بہت سراہا ہے۔ میں نے حال ہی میں تیرہ نارویجن شعراء کے تراجم کیے ہیں جو کہ جلد ہی کتابی شکل میں شائع ہونے والے ہیں۔

ارژنگ: اس سوال کا جواب کیا دیں گے۔ اگر پوچھا جائے کہ لکھتے کیوں ہیں؟

جمشید مسرور: چھوٹا منہ بڑی بات ہو جائے گی۔ مگر خدائی اشارہ تھا۔ میرے اندر سے کوئی چیز آتی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ میں نے کبھی قصداً شاعری نہیں کی ہے۔ جب جب اندر سے آواز آئی ہے۔ تب تب لکھا ہے کچھ ایسی نظمیں ہیں جنہوں نے جگا کر مجھے نصف شب کو خود کو مجھ سے لکھوایا ہے۔ میں نے کبھی خود کو مجبور کر کے شاعری نہیں کی ہے۔

ارژنگ: آپ کی بیگم مرحومہ جو کہ پاکستانی نژاد تھیں، ان کے نام پر اوسلو میں ایک سڑک کا نام رکھا گیا ہے ان کے متعلق کچھ بتائیں گے؟

جمشید مسرور: ان کا نام روبینہ تھا۔ مجھ سے شادی کے بعد روبینہ رانا ہو گئیں۔ وہ بہت ہی ذہین خاتون تھیں۔ بڑے علمی گھرانے میں انہوں نے پرورش پائی تھی۔ ان کے والد اسکوارڈن لیڈر تھے۔ شادی کے بعد جب وہ میرے پاس آئیں تو سب سے پہلے انہوں نے بڑی سرعت کے ساتھ نارویجن زبان پر عبور حاصل کیا۔ تھوڑے ہی عرصے میں انہوں نے اتنی عمدہ زبان بولنا شروع کر دی کہ سب کو حیران کر دیا۔ اس کے بعد انہوں نے لیبر پارٹی میں شمولیت اختیار کی۔ پارٹی میں بھی انہوں نے بہت تھوڑے عرصے میں بہت ترقی کی۔ ٹی وی مذاکروں، مباحثوں میں شرکت کی وجہ سے پورے ناروے میں بہت مقبول ہو گئیں۔ آئے دن اخبارات میں ان کے انٹرویو چھپتے تھے۔ روبینہ نے الیگرنٹ وومن کے متعلق ناروے میں پائے جانے والے اس امپریشن کو توڑ ڈالا کہ یہ عورتیں لوکیس گائے بھینسوں اور بھیڑ بکریوں کی طرح ہوتی ہیں۔ ان کی اپنی کوئی رائے نہیں ہوتی۔ وہ بڑے مختصر عرصے میں ناروے کی مقبول ترین رہنما بن گئی تھی۔ انہیں قومی دن کے موقع پر قومی جلوس کی قیادت کے لیے چنا گیا۔ میں بتا تا چلوں کہ یہ دن اور یہ جلوس ناروے میں بہت ہی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ جلوس کے سربراہ نے قومی اسمبلی کو بھی خطاب کرنا ہوتا ہے اور بادشاہ معظم کو بھی مبارک باد پیش کرنا ہوتی ہے۔

انہی دنوں اوسلو شہر کی ہزارویں سالگرہ منائی گئی۔ اس موقع پر یہاں کا روایتی لباس خصوصی طور پر تیار کروایا گیا تھا۔ اس لباس کو شہر کے سٹی ہال میں پیش کیا جاتا تھا۔ یہ اعزاز بھی روبینہ کو حاصل ہوا کہ اسے اس لباس کو پہننے کے لیے چنا گیا۔ جسے پہن کر نہ صرف وہ سٹی ہال میں گئیں بلکہ ٹی وی پر بھی اس کی لائیو کوریج کی گئی۔ مگر افسوس! جیسا انگریزی میں کہتے ہیں کہ "جو لوگ خدا کو زیادہ محبوب ہوتے ہیں وہ جوانی میں ہی مر جایا کرتے ہیں" بچے ابھی بہت چھوٹے تھے میری بیٹی اُس وقت بارہ سال کی تھی جب روبینہ کا انتقال ہوا۔ انہیں جتنی محبت ناروے کے معاشرے سے تھی اس سوسائٹی نے بھی اسی محبت سے ان کی محبت کا جواب دیا۔

اُن کے جنازے میں ملک کی بڑی شخصیات موجود تھیں جن میں ناروے کے موجودہ وزیراعظم بھی شامل ہیں۔ ان کے انتقال کے بعد ایک متفقہ قرارداد کے ذریعے ناروے کی حکومت نے اوسلو کے بالکل مرکز میں ایک سٹریٹ کا نام "روبینہ رانا سٹریٹ" رکھ دیا۔ یہ کسی بھی غیر ملکی کے لیے بڑا اعزاز ہے۔ جب بھی کوئی پاکستانی مہمان آتا ہے تو میزبان انہیں یہ سٹریٹ دکھانے کے لے ضرور لے کر آتے ہیں۔

2nd Edition

عصرِ حاضر کے نامور دانشوروں کے تاریخی انٹرویوز

گفتگو

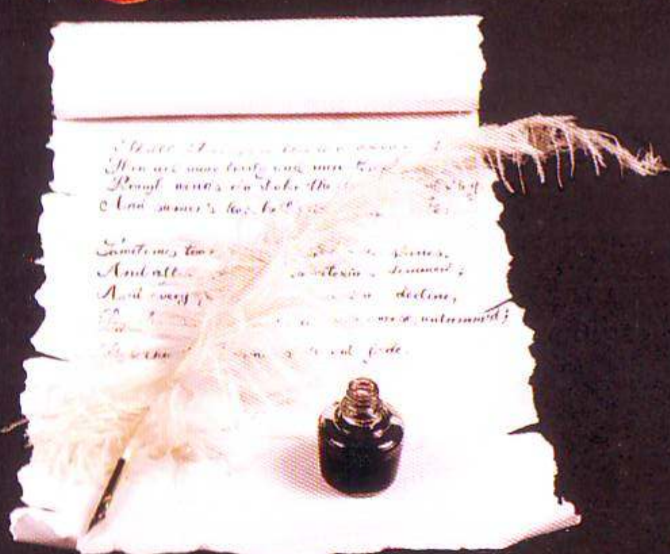

عامر بن علی

ابرار ندیم

عامر بن علی کا ادبی سفر

- محبت چھوگئی دل کو (شعری مجموعہ)
- چلو اقرار کرتے ہیں (شعری مجموعہ)
- سرگوشیاں (شعری مجموعہ)
- یاد نہ آئے کوئی (شعری مجموعہ)
- محبت کے دو رنگ ۔ گبریلا مسترال اور پابلو نرودا (ہسپانوی زبان سے براہِ راست اُردو میں کیے گئے تراجم)
- آج کا جاپان (زیرِ طبع)
- گفتگو (انٹرویوز)
- مکتوب جاپان (کالمز)

ابرار ندیم کا ادبی سفر

- کون دلاں دیاں جانے (پنجابی شعری مجموعہ)
- اب بھی پھول کھلتے ہیں (شعری مجموعہ)
- چلتے چلتے (کالمز)

Read Online
www.amirbinali.com

ماہنامہ ارژنگ اور راوی فاؤنڈیشن انٹرنیشنل کے زیرِ اہتمام
قمر رضا شہزاد کے شعری مجموعہ یاد ہانی کی تقریب رُونمائی

نظامت ندا فاطمہ

کمپیئرنگ طاہر نسیم

ڈاکٹر عزیز الرحمن (امریکہ)، قمر رضا شہزاد، قاضی اشفاق قریشی (کمشنر) آصف علی فرخ، عامر بن علی سٹیج پر تشریف فرما ہیں

اظہار خیال: سہیل انجم شہزاد، مظہر بخاری، کاشف، زاہد ہما، سید نوید ہاشمی، شاکر حسین شاکر، رضی الدین رضی، عامر بن علی، آصف علی فرخ، قمر رضا شہزاد، قاضی اشفاق قریشی

تقریب کے شرکاء